قومی تہذیب اور ہندستانی مسلمان (۳)

عربی اسلامی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم

اور

عصری تقاضے

سید اوصاف علی
عابد رضا بیدار

رامپور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز
۱۹۶۹ء

ڈاکٹر مقبول (پروفیسر ایس مقبول احمد) کی نذر

کوہِ نور پرنٹنگ پریس، دہلی

پیشگفتار

یہ ۱۹۶۹ء میں منعقدہ نئی دہلی کے ایک سیمینار کی روداد ہے

یہ سیمینار اس لئے کیا گیا تھا کہ ہندستانی قوم کی ایک اہم ملت میں ایک قابل لحاظ تعداد تعلیم کی جس خیز تاریخی راہ پر ہنوز گامزن ہے اور جس کے سبب وہ نئے ہندستان کی تشکیل جدید میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لے پا رہی ہے اس کے موقف، مقصد اور مصلح کا تجزیہ کرکے کوئی نشان راہ یا CORRECTIVE دیا جائے۔

خالص تعلیمی نقطۂ نگاہ سے بھی اس سیمینار کی ایک اہمیت تھی جس میں تعلیم کا مقصد، طالب علم کی شخصیت، بچہ کی تربیت اور بہتر تعلیم گاہوں کی تعمیر کے بارے میں، اصل مبحث کے پیش نظر عمومی طور سے بھی غور کیا گیا اور بڑے مفید مشورے سامنے آئے۔

دینی، اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ اسلام کے ایک اہم ستون، تعلیم کے تنِ مردہ میں جان ڈالنے کی ایک اہم سعی تھی جسے نامشکور کسی طرح نہیں کہا جاسکتا۔

اور عربی زبان وادب اور علوم عربیہ کی تعلیم کے لحاظ سے بھی اس سیمینار کی یہ اہمیت تھی کہ آزاد ہندستان میں عربی کی روز افزوں بڑھتی ہوئی سیاسی اہمیت کے پیشِ نظر ان درسگاہوں کو اپنے نئے رول کی بھی خبر دینا تھی۔

بعض امور واضح ہوگئے، لیکن بعض امور میں جو اس وقت تک مبہم رہ گئے جب تک اس سیمینار کے شرکا، اور اسلامی درسگاہوں کے اکابر کے درمیان ایک نتیجہ خیز مکالمہ نہ ہو۔ اس روداد کی اشاعت، اور اس کے ان اکابر کی نظر سے گزر جانے کے بعد میں امید کرتا ہوں کہ کوئی ایسی مفاہمتی صورت ضرور نکلے گی، کسی نمائندہ اجتماع کی صورت میں یا تحریری شکل میں، جس سے کسی نتیجہ پر پہنچا جاسکے۔

یہ جو اجتہاد کے دروازے بند ہونے کی روایت چلی آرہی ہے تنقید کے تیر تو سبھی کے ترکش میں تیار رہتے ہیں، پر کبھی آپ نے اس پر اس نقطۂ نظر سے بھی غور کیا کہ یہ اپنے دور کا کیسا جرأتمندانہ اور دانشمندانہ اقدام تھا۔ میں بتاؤں آپ کو، ہندوؤں کے کاسٹ سسٹم (ذاتوں میں تقسیم) کے سلسلہ میں جواہر لال نہرو اور بعض دوسرے مفکروں کی یہ رائے ہے کہ در اصل یہ بیرونی (مسلم تہذیبی) استیلا سے ہندو سماج کو بچا لے جانے کی ایک کوشش تھی جو اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔

بالکل اسی طرح ہلاکو کے حملہ اور اس سے بھی پہلے مسلم سماج کے شکست و ریخت کے آثار کی نمود دیکھ کر اس وقت کے بوجھ بجھکڑوں نے یہ بہتر سمجھا کہ، اکاؤنٹ فریز کر دو، کچھ نہ کچھ تو بچ ہی جائے گا، ورنہ تو سیلاب میں سب کچھ بہا جا رہا ہے۔ نیت نیک تھی، لیکن ظاہر ہمیشگی کے لیے تو نہیں تھی۔ بس اب بہت بہت ہو چکا، اب اپنا رستہ خود نکالیے۔

تو میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ جس طرح فقہ میں اجتہاد کا دروازہ بند کر کے رخنے پڑنے کا سدباب کرنے کی کوشش کی گئی، بالکل اسی طرح علوم اسلامیہ کے سلسلہ میں ہوا کہ نئی نئی ہواؤں سے نئے نئے ضرر پہنچنے کے اندیشے دیکھ کر اجتہاد کے دروازے ہی بند کر دیئے گئے۔ حتیٰ کہ کتابیں متعین کر دی گئیں جو اس وقت تو بظاہر ایک صریح حماقت سی لگتی ہے کہ مضمون کی جگہ کتابیں متعین ہوں! لیکن یہ سب تھا اسی سلسلہ کا سوچا سمجھا دانشمندانہ اقدام!

گب اور باوین نے ("اسلامک سوسائٹی اینڈ دی ویسٹ": I/۱۵۹-۲) اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ میرے مفہوم سے زیادہ دور نہیں ہے:

"تعلیمی عمل کو اُستاد اور شاگرد دونوں اس سے زیادہ کچھ بھی سمجھتے تھے کہ ایک علم کی متعین مقدار حاصل ہو جائے، اور طے تھا کہ یہ سارا علم ایک معلوم مقداریں اور قطعی متعین حدوں میں موجود ہے، معلوم مقدار نہ سہی معلوم کیا جا ہی سکتا ہے....

"تعلیم کے سامنے اب یہ امر بھی نہ رہا تھا کہ سماج کو اپنے نصب العین کی بہتر نمونہ

میں ڈھال سکنے کی کوئی امید بھی ہو، بس سماج کو روایت کا پابند بنا کے بکھر جانے سے البتہ روکے رکھ رہی تھی۔۔۔۔۔ اور اب چونکہ یہی طے سا ہو گیا تھا۔ انتشار وانخلال اور معاشی زوال کے دَور میں مسلم سماج کو انتشار سے بچانے کی ذمہ داری ان کی ہے، تو ظاہر ہے مدرسو، کے سنبھالک' دانشوروں کی مہم جوئی کا انداز اختیار کر کے اتنا بڑا رسک تو نہیں لے سکتے تھے، اس لیے ہمارے خیال میں اس تعلیم کے سماجی رول کا (جو ماضی میں رہا ہے) اعتراف کر لینا چاہیے"۔

ہندستان میں انگریزی دَور کا باقاعدہ آغاز ۱۸۵۷ء سے ہوا۔ یہاں اس اس سے پہلے جا بجا مدرسے قائم تھے، لیکن، اس کے بعد سے تو ایسا لگتا تھا جیسے آندھی، طوفان، اور سیلاب نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے جیسے اپنا سب کچھ اس میں ڈُوٹ اور بہہ جائے گا، اگر کچھ کیا نہ گیا، اور پھر جلدی جلدی ملت کے خیر خواہوں نے ایک تو خود مغربی علوم کا اعلیٰ تعلیمی مرکز علی گڑھ میں قائم کر دیا۔ اور دوسرے انداز کے سوچنے والوں نے گاؤں گاؤں اسلامی عربی تعلیم کے لیے مدرسوں کا ایک جال بچھا دیا۔ آج ہم اُن دردمندوں کی سادہ لوحی پہ لاکھ تنقید کریں، لیکن میرے پچھلے بیان کیے ہوئے اقدام کی مانند یہ بھی اتنا ہی پُرخلوص اور اہم کام تھا جس میں نیت بھی بخیر تھی، اور ایک خاص حد تک جس نے مغرب پرستی میں توازن لانے کا کام بھی انجام دیا (جیسے دوسرے رُخ سے اکبر کی شاعری نے!)

لیکن پچھلے اقدام ہی کی مانند اس اقدام کو بھی ہمیشگی تو نہیں دی جا سکتی۔ آج بھی ہمارے لیے علی گڑھ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا دیوبند۔ لیکن دونوں کے موقف، طرزِ فکر، اور اسی طرح طرزِ تعلیم و تحقیق میں، انقلابی تبدیلیوں کو میں نہیں کہتا، کم سے کم اصلاح تو ضروری ہے ہی ایسی کہ: ایک تو دونوں ایکدوسرے کے حریف کے بجائے حلیف بن جائیں!

دوسرے یہ کہ دونوں کے زائیدہ فاضل، قوم کے لیے بوجھ نہ بنیں، بلکہ سرمایۂ افتخار!!

عابد رضا بیدار

فہرست

عابد رضا بیدار

برقے کہ بخود بپیچد، میرد بسحاب اندر

یہ مسئلہ زیرِ بحث کیوں آیا؟

ایک تو اس لیے کہ اب یہ ایک عام خیال ہوگیا ہے کہ عربی و اسلامی مدارس کے فارغ التحصیل طلبا، اپنے سماج کے لیے تو فائدہ بخش عنصر بننے کے بجائے طفیلیے (PARASITES) بنجاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انہی مدارس کے زائیدہ عناصر ہوتے ہیں جو ہر اس اقدام کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں، جو نئی نوع کی ترقی کے لیے اٹھایا جاتا ہے۔ تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ اب ان مدارس سے نہ کوئی شاہ ولی اللہ پیدا ہوتا ہے نہ ابن سینا، نہ غزالی، نہ ابنِ رشد۔ اس طبقے میں نہ وسعت نظر آپاتی ہے نہ جرأت افکار نہ مستی کردار! یہ ابو حنیفہ اور شافعی کو پڑھتے چلے آرہے ہیں مگر خود ان میں کوئی ابو حنیفہ کوئی شافعی نہیں پیدا ہوتا۔ نئی فکر یا ذاتی تفکر کے نام سے کانپتے ہیں اور (INITIATIVE) لیتے ہوئے ڈرتے ہیں اور لوگوں میں تقلید جامد، غیر سائنسی خیالات اور مذہب کے ناتربیت یافتہ تصور کو پھیلانے میں ایک وسیلہ ثابت ہوتے ہیں۔

—— یہ سب کیوں؟

ان کے اس طفیلے پن، اس ظلمت پسندی اور اس جامد تقلید کے کچھ اسباب ضرور ہیں۔ کچھ کمی ہے اس نظام و نصاب میں، اس طریق درس و تدریس میں جو ہمارے یہاں عرصہ دراز سے اور اپنی بالکل موجودہ ہیئت میں کم سے کم عہد

اور بگ زیب سے شروع ہوتا ہے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لئے مکمل اوور ہالنگ، (OVER-HAULING) کی ضرورت ہے یا معمولی مرمت سے کام چل جائیگا؟ پچھلے اصلاحی اقدامات میں ندوۃ العلماء ــــ یا میر عرب مدرسہ بخارا یا تازہ ترین، جامعۂ زیتون اور جامعہ ازہر اصلاحی قانون، کسے رہنما بنایا جاسکتا ہے ؟

اور سب سے بڑھکر یہ کہ کیا دینی و دنیوی تعلیم کی تقسیم چلتی رہے گی؟ تہذیب اسلامی کو ارتقا کے کسی دور میں جانے کس خدا کے بندے نے جان و تن کی دوئی کی غلط اندیشی کی ابتدا کر دی جس نے تعلیم کے میدان میں علم الادیان اور علم الابدان کی بنا ڈالدی، ایسی کہ دونوں ایک دوسرے کا منھ دیکھنے کے بھی روادار نہیں رہے۔ کیا واقعی علوم کو مادّی اور روحانی حصّوں میں بٹا رہنے دینا چاہیئے؟ خود علم الادیان کی تفہیم کی خاطر ہی ان ناگزیر علوم کا مطالعہ کیا ضروری نہیں ہے جو TOOLS کا کام دیں گے؟

ہمارے مفکروں میں ایک طبقہ کا خیال ہے کہ اس نظام تعلیم ہی کو ریکھر پلٹ دینا چاہیئے کہ یہ قطعی ناکارہ ہو چکا ہے۔ دوسرے طبقہ کا خیال ہے کہ اسے جوں کا توں برقرار رکھنا چاہیئے کہ اس کی اپنی ایک افادیت ہے اور یہ کہ روزگار کا جہاں تک تعلق ہے تعلیم کو ذریعہ معاش بنانا ضروری نہیں اور ـــ اس تعلیم کے بعد، جیسے کسی دوسری تعلیم کے بعد ـــ کوئی بھی آزاد پیشہ اختیار کیا جاسکتا ہے کوئی ہنر بھی سیکھا جاسکتا ہے! وغیرہ،

اور ایک تیسرا طبقہ ہے جو اس نظام میں اصلاح کر کے اسے برقرار رکھنا چاہتا ہے۔

انسانی شخصیت اپنے اظہار کے لئے ایسی بے چین واقع ہوئی ہے کہ محض بہانے ڈھونڈھتی ہے یہ بہانے اسے تعلیم و تربیت میں علوم و فنون میں مل جاتی ہیں۔ دنیا میں سب کوئی تو سب کچھ کرنے سے رہے لیکن جو جس میدان میں نکل گیا اور وہ اس کی طبیعت کے مناسب حال بھی ہو گیا تو وہی اس کے جوہر چمکاتے

کا باعث بھی بن جاتا ہے (جس نے جو عالم بنا ڈالا وہ اس کا ہو گیا) اس میں نہ کسی ایک کی فضیلت کو دخل ہے نہ کسی دوسرے کی حقارت کو۔ کوئی علم یا فن نہ بہ ذاتِ خود بڑا ہے نہ چھوٹا۔ شخصیت کے امکانات بقدر اس علم یا فن میں گہرائی یا وزن بھی ہوتا ہے: یعنی، ہر علم اور فن شخصیت کے لیے اوپری جلا کا کام کرتا ہے کہ وہ جوہر ہے اور تعلیم محض عرض۔ اہم چیز جو ہے وہ تو شخص ہے نہ کہ اس کا لباس جو اس نے تعلیم کے نام پر پہن رکھا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ ہر شخص کی شخصیت ہر علم یا ہر فن میں نہیں چمک پاتی۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا؛ اس کے لئے مناسبت یا ذہنی موافقت ضروری امر ہے ۔۔۔ یا پھر شاید یہ بات ہو کہ: ہر شخص کی شخصیت بھی تو نہیں ہوا کرتی۔ مکھی مچھر بھی تو خدا ہی کی مخلوق ہیں دسویں درجے اور اس سے پہلے گاندھی جی کے جو جو ہم مکتب تھے ان میں سے کتنوں کے نام آج ان کے شہر والے بھی جانتے ہیں!! ذاکر حسین کے انٹرا اور بی اے کے ساتھیوں میں کتنوں کو آج علی گڑھ بھی جانتا ہے!!

غرض اس سے بحث نہیں کہ کوئی علم و فن کی کس شاخ میں اختصاص حاصل کر رہا ہے اصل چیز اس علم و فن کی تعلیم و تدریس کا پیرایہ اور نظامِ کار۔۔۔ اور اس سے بھی بڑھ کر زندگی کے ساتھ اس کا ربط ہے۔ ایلوپیتھی کو لازماً طب یونانی پر فوقیت نہیں ہے لیکن یہ اس وقت جب طب یونانی میں کسی مسیحا نفس کی بدولت نئی زندگی کی لہر دوڑ چکی ہو۔ اور وہ جدید تر تقاضوں سے ہم آہنگ ہو چکی ہو۔ اجمل خاں نے یہی کرنے کی ایک کوشش کی تھی۔ اردو ادبیات کا پروفیسر لازماً زندگی میں بظاہر کام آنے والے معتبر قسم کے مضامین کے پروفیسروں سے کمتر نہیں ہوا۔ وہ کبھی کبھی ۔۔۔ جب اس مضمون سے شخصیت ہم آہنگ ہو جاتی ہے تو ۔۔۔ رشید احمد صدیقی بن جاتا ہے جو علی گڑھ کے عہدِ اخیر کی آبرو کا ایک پائندہ نشان بن جاتا ہے عربی کا فاضل لازماً ملائے مکتبی ہی نہیں بنتا ڈاکٹر عابد علیم بھی بن جاتا ہے اور دینیات

کا حصول لازماً دور کعت کا امام ہی نہیں بنتا ، پاکستانی سیاست اور اسلام کا ایک
اہم نام ابوالاعلیٰ مودودی ، اور ہندوستانی سیاست اور اسلام کا ایک اہم کردہ
نام ابوالکلام آزاد بھی بن جاتا ہے کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ تعلیم کسی چیز کی ہوتی ہے
اور شخصیت اپنا وسیلۂ اظہار کہیں اور ڈھونڈتی ہوتی ہے ۔ طب کا فاضل براؤن ،
ادبیات فارسی میں ، قانون کا ماہر عبدالودود ادبیات اردو میں !!! اقتصادیات
کا ماہر ذاکر حسین تعلیمات اور اخلاقیات میں !!!

بالآخر شخص اہم ہے نہ کہ ذریعہ ! ۔۔۔ ذریعہ تعلیم !!

اس لئے یہ قدیم مدارس عربیہ و مشرقیہ و اسلامیہ کوئی ایسی چیز نہیں جسے ہم بالکل
از کار رفتہ قرار دے کر میوزیم میں بھیجنے کا سامان کرنے کی بات سوچیں ۔ انہی مدارس
نے ہند اسلامی کی ممتاز غیر معمولی اور عظیم شخصیتوں کو جنم دیا ۔ لیکن اب بدلتے
ہوئے حالات کے ساتھ ان میں بعض اصلاحیں ، ترمیمیں ، اضافے اور تبدیلیاں
ناگزیر ہیں ۔ اگر بدستور ان سے بڑی شخصیتیں ایک بڑی تعداد میں ڈھالنے کا کام
لیا جانا جاری رکھنا ہے ! بدلتے ہوئے حالات سے مراد نئی آگہی ۔ علوم کے نئے افق ،
اور تعلیم و تدریس کے نئے طریق کار ہیں ۔

مقصود صرف نئے زاویوں ، نئی جہتوں ، نئے امکانات اور نئی بصیرتوں
سے آشنا کرانا ہے ۔ جن سے آپ آنکھیں موند لیں تو ان کے وجود کو جھٹلانے کا
یہ کوئی معقول ثبوت تو نہیں ہوگا ، وہ تو زمانے کے ساتھ ساز کر کے آپ کے
وجود کو جھٹلا دیں گے ۔۔۔ اور کیا ایسا ہو نہیں رہا ہے !!!

قبل ازیں جو لوگ اس بارے میں سوچتے اور لکھتے رہے ہیں ان میں عہد جدید
بات غالباً شبلی سے شروع ہوتی ہے جنہوں ۱۹۰۴ء میں سب ایسی بنیادی حقیقتوں
کو پا لیا تھا جو آج بھی بہتوں کی نگاہوں سے اوجھل ہیں ان کا خیال تھا کہ اس نظام
میں مندرجہ ذیل نقائص ہیں :

کتابیں نہ کہ علوم ۔ آزادانہ کے بجائے پابندِ نظر کی تخلیق اور علوم دینی اور اسی حد تک جو یونانیوں سے عربوں نے لئے تھے ۔ اس کے بعد جو ترقی ہوئی اس سے قطعی ناواقفیت ۔

آصف فیضی نے اپنی تنقید میں جن مضامین کو شامل کرنے پر زور دیا ہے ان میں تقابلی مذاہب کا جدید علم خاص طور سے قابلِ ذکر ہے ۔ انہوں نے سامی زبانوں اور اہم جدید زبانوں کا شمول بھی ضروری قرار دیا ہے ۔

ابوالحسن علی ندوی نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس سلسلہ کی تازہ ترین فکر سمجھنا چاہیئے ۔ اس کی اس لحاظ سے بھی اہمیت ہے کہ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم بھی ہیں، اور دنیائے اسلام میں درجۂ اول کے مفکر بھی سمجھے جاتے ہیں ۔

”کسی ادارے یا کسی زندہ جماعت کے لیئے اپنی عمر میں صرف ایک بار حقیقت پسندی سے کام لینا، مادی نظام کے اندر ضروری تبدیلی پیدا کرنا اور اپنے آپ کو ہم آہنگ بنا کر ہی کوشش کرنا کافی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کسی ادارے کی افادیت، عملی زندگی میں اس کا مقام اور وہ رول جو وہ ادا کرتا ہے تنہا اس کی حیات کا ضامن ہے ۔

۔ ۔ ۔ تعلیم کی موجودہ ثنویت یا دوئی غیر اسلامی اقتدار کے عہد کی بدعت ہے ۔ پہلے ہمارا نظام تعلیم وحدانی اور سالمیت پر مبنی تھا ۔ ہمارا قدیم نصاب تعلیم جس کی درس نظامی نمائندگی کرتا ہے، مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں ملک کا واحد نظام تعلیم اور ثقافت، ذہنی تربیت کا واحد ذریعہ تھا ۔ یہ جہاں محدث، فقیہ اور مدرس تیار کرتا تھا، وہاں سول سروس کے عہدہ دار اور ارکانِ سلطنت بھی مہیا کرتا ۔ اس درس کی پیداوار جس طرح ملا محب اللہ بہاری اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی تھے اسی طرح علامہ سعد اللہ وزیر سلطنت بھی تھے ۔ یہی حال دوسرے ملکوں میں بھی تھا کہ دینی و دنیوی تعلیم کے دو الگ الگ نصاب اور نظام نہیں تھے چنانچہ سب کو معلوم ہے کہ مشہور ریاضی داں شاعر عمر خیام اور سلطنت سلجوقیہ کا وزیر باتدبیر نظام الملک طوسی دونوں ایک ہی حلقۂ درس کے شریک اور ایک ہی تعلیم کے پیداوار تھے ۔“

اتنا کچھ لکھنے کے بعد اپنی اصلاحی تجاویز اس طرح دی ہیں:

"پرائمری اور مڈل کے مرحلے تک ایسا مشترک نصاب تعلیم بنے جو تمام مسلمان بچوں کے لئے قابل استفادہ ہو۔ اور جو ان کو اسی معیار کی تعلیم دے جسکے حصول کے لئے ان کو سرکاری مدارس اور اسکولوں کا رخ کرنا پڑتا ہے اس اضافے کیساتھ کہ اسمیں دینیات کا عنصر نمایاں ہو۔ اخلاقی اور دینی تربیت کے لیے بہتر ماحول اور تعلیمی نتائج عام سرکاری اسکول سے بہتر ہوں۔

"اس مرحلے کے بعد ثانوی تعلیم کے ساتھ جدید ضروری مضامین سائینس، جغرافیہ، تاریخ اور انگریزی وغیرہ کی تعلیم ہو۔ اس مرحلے کے بعد اب طلباء میں پوری احتیاط اور دقت نظر کے ساتھ انتخاب کیا جائے جو لوگ اس تعلیم پر اکتفا کرنا چاہیں وہ دوسرے میدانوں کی طرف رخ کر سکتے ہیں۔ اگر مزید تعلیم کے لئے اسکول اور کالجوں کا رخ کرنا چاہیں تو وہ ایسی حالت میں وہاں جائیں گے کہ وہ ضروری دینی واقفیت حاصل کر چکے ہوں گے۔ ان کے ذہن میں ایک بنیاد پڑ چکی ہوگی عربی سے ان کو ایسی مناسبت پیدا ہو چکی ہوگی کہ وہ اگر اپنے آئندہ تعلیمی مرحلے میں عربی کو بطور زبان کے لینا چاہیں تو وہ اس میں دوسروں کے مقابلے میں زیادہ کامیاب رہیں گے۔

"اس مرحلے کے بعد عربی تعلیم و علوم دینیہ کو جاری رکھنے کی اجازت ان لوگوں کو دی جائے گی جن کے اندر ذہانت، عربی علوم کی تکمیل کی صلاحتیں اور شوق و ولولہ پایا جائے اور وہ دینی علوم کی خدمت کو اپنا بنانے پر آمادہ اور تیار ہوں، اور جو دلی لگن اور یکسوئی کے ساتھ اس سلسلہ کی تکمیل کر سکیں۔"

(ندوۃ العلماء کا کتابچہ ۶۷ — ۶۸)

لیکن مولانا سے پہلے ایک بہت وسیع النظر عالم جسکی فراست ایمانی کی داد کچھ آنے والا زمانہ ہی دے سکے گا" اس نے اس موضوع پر ایک بیش بہا کتاب بھی لکھی ہے، ۱۹۵۳ء میں اس نے اپنی فکر کا نچوڑ اس طرح لکھا تھا:

"ایک نیا ہندوستان پیدا ہو چکا ہے اور پیدا ہو رہا ہے اس وقت دینی

اس ملک میں محمد رسول اللہ ؐ کے دین کی خدمت کا فرض ادا کرسکتے ہیں۔ جو آنے والے حالات سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے ذرائع سے اپنے آپ کو مسلح کر رہے ہوں۔ سوچنے کی بات ہے، اسلامی علوم کو ہندی قالب اور ہندی مزاج کے مناسب بنانے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟ ضرورت ہے کہ اس سوال کی اہمیت کا اندازہ کیا جائے اور "فانفروا خفافاً و ثقالاً" جس سے جیسا ممکن ہو اپنے آپ کو تعلیمی زندگی کے مغتنم دور میں تیار کرلے۔

ہندوستان سے باہر اسلامی درسگاہوں میں جو اصلاحیں ہوئی ہیں ان میں سوویت وسط ایشیا کی اصلاحیں اس لحاظ سے مفید مطلب نہیں ہیں کہ وہاں ان لوگوں کا مقصد امام اور موذن ہی تیار کرنا ہے تاہم قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے حدیث و تفسیر، لغت صرف و نحو، قرارت و تجوید اور اصول دین کے بنیادی مضامین کے ساتھ ساتھ: تاریخ جغرافیہ، حساب، روسی زبان، مادری زبان، اور سوویت دستور کے مضامین بھی چار سالہ کورس میں شامل رکھے ہیں (ادرمیتو مادر لو: اگست ۶۵ء)

ٹیونس کی مشہور اسلامی درسگاہ جامعہ زیتونہ کی کایا پلٹ البتہ قابلِ ذکر ہے وہاں کے لوگوں کا اصرار تھا کہ تاریخِ قانون، تاریخِ مذاہب، عمرانیات؛ تاریخِ عرب، تاریخ عالم، مسلم فلسفہ، طبیعیات، کیمسٹری اور ریاضیات کے ساتھ کوئی ایک بیرونی زبان بھی نصاب میں شامل رہے اور یہ کہ یہ سب علوم باہر سے ماہرین آکر پڑھائیں۔

معمولی پیوندکاری چلتی رہی تاآنکہ ۵۶ء میں جب آزادی ملی تو فوراً پرائمری اور سیکنڈری حصے جامعہ سے الگ کر دیئے گئے اور مسجد کے بجائے وزارت تعلیم کے تحت ان کی خود مختار حیثیت کر دی گئی۔ زیتونہ خود بھی ایک پبلک ادارہ ہوگئی جس کا ناظم حکومت مقرر کرنے لگی۔ اور اس کی حیثیت دینیات کے مطالعہ کیلئے ایک فیکلٹی کی سی ہوگئی جس میں ایک زبان و ادب عربی کا شعبہ تھا ایک تشریعت

اسلامیہ کا۔ پھر جب ۱۹۶۰ء میں ٹیونس یونیورسٹی وجود میں آگئی تو زیتونہ اس کی ۶ فیکلٹیوں کے منجملہ دینیات اور علوم مذہبی فیکلٹی کے نام سے نئے دور میں داخل ہوئی نصاب میں تاریخ مذاہب، تاریخ فقہ، تاریخ تونس باقاعدہ داخل ہو گئے۔ اور زبانوں میں یونانی اور فارسی — اور فرنچ یا انگریزی میں سے کوئی ایک۔

اکتوبر ۶۱ء کے قانون کی رو سے دینی تعلیم کے لئے دیا جانے والا وقت تو کم کر دیا گیا لیکن مواد بڑھا دیا گیا۔ قانون کی تشریح میں تفصیل سے بتایا گیا کہ تونس اسلامی روایات سے وابستہ ملک ہے اور یہ روایات قائم رکھنی ہیں اس لئے یہاں پہلے سال سے بچہ کو روحانی ماحول مہیا کیا جائے گا جس سے مذہب کا رول اور قدر و قیمت پہچاننے میں آسانی ہو گی۔ اسے اسلام کی بنیادی باتیں اور عمل کرنا سکھایا جائیگا اب تک کی روش کے برخلاف صرف حفظ قرآن کافی نہیں سمجھا جائے گا۔ بلکہ تفسیر قرآن بھی؛ اور اس سے بھی آگے یہ بھی کہ اسے زندگی میں کیسے برتا جائے تاکہ قرآن سے محبت بھی ہو اور لفظی کج بحثیوں سے بھی نجات ملے۔ پھر یہ کہا گیا کہ سیکنڈری مرحلے پر مطالعہ دین کے سائنسی طریقہ کار پر زور ہونا چاہیئے جس میں سماجی نفسیاتی اور اخلاقی عوامل بھی زیر مطالعہ رہیں۔ مختصر یہ ہے کہ گویا افکارِ اسلامی کا ایک عمرانی مطالعہ ہو یعنی SOCIOLOGY OF RELIGION۔

بالآخر اس بنیاد پر نظام و نصاب کی نئی تشکیل ہوئی اور ۴ سال لائسنس کورس، ۳ سالہ ڈپلوما کورس، اور ۴ سالہ ڈگری کورس طے پایا۔ ڈگری کلاس کے طلبا پہلے دوسرے سال فلسفہ، لسانیات، تاریخ، ایک بیرونی زبان — اور قرآن و حدیث؛ اور تیسرے چوتھے سال میں قرآن و سنت کے ساتھ افکارِ اسلامی فلسفہ، تاریخ مذاہب؛ فرقِ اسلامیہ تصوف اور تاریخ میں تخصص سیا

پھر اصول فقہ و تاریخ فقہ میں تخصص جس کے ساتھ سوشیالوجی کے ادارے اور تاریخ ضروری رکھدی گئی (مسلم ورلڈ: اپریل ۶۸ء)

ان سب اصلاحوں میں ایک شعوری مقصد واضح ہے: یہ کہ پیوندکاری ہیکا

ہے یہ کہ چند گھنٹوں کے لئے سائنس کی ابتدائی تعلیم دے کر دینیات کی فیکلٹی کو جدید نہیں بنایا جاسکتا! یہ کہ دینیات جو نئے سوال پوچھتی ہے۔ اب قرآن کے لئے ایک نئی اپروچ درکار ہے: دین ودانش میں کیا رشتہ ہو؛ حدیث کے مطالعہ کے لئے روایتی اور جدید سائنسی طریقہائے کار میں کیا ربط ہو؛ الوہیت اور وحی، مذہب اور فلسفہ دونوں کے نقطۂ نظر سے اب کس طرح سمجھ میں آتے ہیں؛ مصری، یونانی، رومی علم الاصنام اور ہندو مذہب، بدھ مذہب، کنفیوشس کا دین اور عیسائیت کا مطالعہ ـــــ یہ سب اس نئی آگاہی کی نشاندہی کرتی ہیں کہ نئے علوم سے اسلام کو کیسے مربوط کیا جائے! اور کیسے اس کی تشکیلِ جدید کی جائے!!

ازہر کا قانون اصلاح سب سے زیادہ اہم اور دوررس نتائج کا حامل ہے۔ ازہر کو عالم اسلام میں ایک ممتاز دینی درسگاہ کی حیثیت سے جو احترام حاصل رہا ہے، اس کی وجہ سے اس کے اندر کسی بھی نئی تبدیلی کا جلد یا بدیر اسلامی معاشرہ پر اثر پڑنا لازمی ہے یہ قانون بھی ۱۹۶۱ء ہی میں بنا (مڈل ایسٹ جرنل: ۱۹۶۶ء)

ازہر کے سلسلہ میں نئے مصر کے مفکروں کا کہنا تھا کہ اس نے جو ایک عرصہ تک بیرونی دباؤ کے مقابلہ پر اپنے کو ریزرو کرکے بچائے رکھا، اب جب ریزرو رہنے کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے اور زندگی اس کے چاروں طرف پوری قوت سے

ابل پڑی ہے، نئے تقاضوں سے ہم آہنگی اس کے لئے ضروری ہو چکی ہے تاکہ وہ دین کا بھی دفاع کرسکے اور اسلامی ورثہ کی بھی حفاظت کرسکے یہ مسئلہ اس طور پر سامنے آیا تھا کہ جدید یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل دنیا بھر کے بارے میں جانتے تھے۔ مگر مذہب کے بارے میں کورے ہوتے تھے، دوسری طرف ازہر والے دینیات کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے مگر دنیا کے علوم میں کورے ہوتے تھے یعنی سماج سے الگ تھلگ تو کیا ہو؟ تفسیر اور مثلاً میتھیمیٹکس کو ساتھ ساتھ کیسے چلایا جائے؟ سوال طالب علم کے لئے کام کے قابلِ برداشت بوجھ کا بھی تھا!

ازہر اصلاحی قانون نے مندرجہ ذیل امور کو اپنا ہدف بنایا:

(١) ایسے اسکالر پیدا کرنا جو علوم دینی سے واقف ہوں لیکن عملی علم و تجربہ سے بھی ، تاکہ آئندہ کے لیئے دین ان کے لیئے پیشہ یا روٹی روزی کا تنہا ذریعہ بننے سے رہ جائے۔

(٢) ازہر اور دوسری جامعات کی حد بندی ختم کرنا تاکہ ازہر والے والے علم و عمل کے تمام میدانوں میں مساوی طور سے مطابقت کرسکیں۔ (٣) علم و تجربہ کی یکساں مساوی مقدار ازہریوں کو بہم پہنچانا تاکہ وہ دانشوری اور نفسیاتی طور سے بھی دوسرے فرزندان مصر سے کسی جگہ ہٹے نہ ہوں۔

نئے مصر کے مصلحین کا خیال ہے کہ ازہر کی اس اصلاح کے بعد مذہب جو پیشہ بننے سے بچ گیا ہے تو اس کی تجارت بھی اب آسانی سے نہ ہو سکے گی۔ دوسرے یہ کہ سماج سے کٹے ہونے کا احساس بھی ختم ہو جائے گا۔ اور تیسرے یہ کہ باہر کے ہزاروں طالب علم اب جب یہاں سے نکل کے اپنے اپنے ملکوں میں جایا کریں گے تو اپنے سماج کا قابل قدر حصہ بنا کریں گے نہ کہ ایک قابل نفرت بوجھ! ازہر جو عوام کی زندگی اور ان سے مسائل سے تعلق کھو چکی تھی، مصری قائدوں کا خیال ہے کہ تعمیر نو کے اس منصوبے سے ازہر کا قدیم مرتبہ واپس آسکے گا، اور ماضی اور حال کا رشتہ مضبوط تر ہو سکے گا۔ مشہور عالم شیخ محمود شلتوت نے اس سلسلہ میں بہت دلچسپ بات کہی ہے کہ نئے قانون کا منشا یہ ہے کہ "علماء اسلام کی خاطر جئیں نہ کہ اسلام کے ذریعہ"۔ ازہر کے ریکٹر نے اس میں سلف کی علمی اور دینی روح کی بازیافت دیکھ لی اس طور سے کہ جس طرح "عہد گذشتہ میں کوئی عالم ایسا نہیں ہوتا تھا جسے محض عالم دین سمجھا جاتا ہو"، اسی طرح اب عالم کا مطلب علوم کو جاننے والا لیا جایا کرے گا نہ کہ عالم دین۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ عالم علم دین پر بھی دوسرے علوم کی طرح حاوی ہوا کرے گا۔

یہ بات بھی بطور خاص سامنے لائی گئی ہے کہ رسول کریمؐ عام زندگی کا ایسا ہی کام کاج اور بوجھ بار سنبھالے ہوئے تھے جیسے کوئی بھی دوسرا شخص! اور یہ کہ اسلام کبھی بھی بطور پیشہ ہمارے اسلاف کی خدمت گزاری پر مامور نہیں ہوا!

"آپ سے اپیل کی جاتی ہے کہ مسجدوں کو علم کے میناروں میں تبدیل کر دیجیے مسجدوں کو صرف نمازوں کے لیے مختص سمجھنا غلط ہے"، مصریوں کے نام اس اپیل نے اگر واقعی اثر کیا تو بہت قلیل عرصے میں کایا پلٹ جائے گی۔ اس دوران میں مصری دانشوروں میں بحث جاری ہے کہ کیوں نہ علماء کے طبقہ کو سرے سے بالکل ختم ہی کر دیا جائے! اور یہ کہ مستقبل میں علمائے دین نہیں ڈاکٹر، انجنیئر، وکیل ہوں جو دین پر بھی حاوی ہوں۔

ازہر کی تنظیم نو میں قدیم نصاب و نظام کو دو فیکلٹیوں میں بانٹ دیا ہے: علوم اسلامیہ ــــ اور علوم عربیہ۔ اور میڈیسن، بزنس ایڈمنسٹریشن، انجینیرنگ اور دوسرے کرافٹ اور زراعت کی مزید فیکلٹیوں کا اضافہ کر دیا گیا ہے اس طرح ازہر مصر کی دوسری یونیورسٹیوں کے مساوی مرتبہ کی ملک کی پانچویں یونیورسٹی بن گئی ہے۔

ازہر اور زیتونہ جیسی تاریخی اسلامی درسگاہوں میں انقلابی تبدیلیاں آچکی ہیں اور پھر دنیا اس عرصہ میں کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور آخری بات یہ کہ اپنے ملک میں خود مختارانہ طور پر ہمیں اصلاح کے پورے مواقع حاصل ہیں ــ شاید بعض اعتبارات سے اسلامی ممالک سے بھی زیادہ! تو، گرد و پیش کو نظر میں رکھتے ہوئے دنیا میں سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کو دیکھتے ہوئے عالم اسلامی میں فکر کے دھاروں کا مطالعہ کرتے ہوئے ــــ اور ہندوستانی مسلمانوں کو کارآمد مفید اور مہذب شہری بنانے کا نصب العین پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں اپنی اسلامی درسگاہوں کے نظام و نصاب میں کچھ ضروری تبدیلیاں لانی ہیں:

(۱) قرآن و سنت، کے ساتھ تقابلی مذاہب کا مطالعہ؛ علی گڑھ اسٹائل کی جنرل ایجوکیشن؛ کم سے کم ایک مغربی زبان کم سے کم دو اسلامی زبانیں؛ تاریخ تہذیب اسلامی؛ تاریخ علوم اسلامی؛ کسی ایک علم اسلامی میں اختصاص ــــ یہ کم سے کم درجہ پر وہ متعلقہ علوم ہیں جن کا شمول ناگزیر ہے۔

(۲) ذریعہ تعلیم بہتر ہے کہ اردو کو بنایا جائے۔

(۳) مکتبوں کا درجہ رکھنے والے اداروں کی یہ بات نہیں کرتا۔ ساری بڑی اسلامی درسگاہوں کو مفید اعلیٰ تعلیم کے اداروں کا درجہ دے دیا جائے اور ایک ایک مرکز ایک ایک علم کی اختصاصی تعلیم کے لئے طے پا جائے۔ چھوٹے درجے والے اداروں کو ہائی اسکولوں میں تبدیل کر دیا جائے اور رائج الوقت ہائی اسکول نصاب کو اپنا کر اپنے موجودہ نصاب کے ساتھ اس طرح جوڑا جائے کہ طالب علم پر اسکی سکت سے زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ دوسرا بدل (ALTERNAT.VE) یہ ہے کہ ان میں (MULTI-PUR POSE) سسٹم چلایا جائے اور انڈسٹریل ٹریننگ سینٹر کے طور سے کام میں لایا جائے جہاں ان سارے پیشوں کی تعلیم دی جائے جو دوسری جگہ سکھائے جاتے ہیں۔

ان سارے اداروں کو ایک نظام میں پرو دیا جائے اور اس کے لئے ایک کونسل بنائی جائے۔

(۴) مسلم اوقاف کا سرمایہ ان اداروں کی سقیم مالی حالت کا سدھارنے کے لئے کام میں لایا جائے۔

۱۹۵۰ء کے ایک اندازے کے مطابق ہندوستان میں قدیم انداز کی ۸۸ بڑی درسگاہیں موجود ہیں جن میں درس نظامی دیا جاتا ہے ان میں سب سے اہم دیوبند ہے جس میں ہزار بارہ سو طلبا تعلیم پاتے ہیں جو ایشیا کا ازہر کہلاتا ہے۔

۱۶۹۳ء میں اورنگ زیب کے زمانے میں فرنگی محل میں اس سلسلہ کی بنیاد پڑی جو معمولی ترمیم و اضافے کے بعد قدیم درس کی ترقی شکل ہے۔ ملا قطب الدین، ملا نظام الدین اور عبدالعلی بحرالعلوم کا یہ فرنگی محلی سلسلہ 'درس نظامی' ہندوستان کا سب سے زیادہ متداول نظام تعلیم ہے جو مندرجہ بالا بڑی درسگاہوں کے علاوہ قریہ قریہ پھیلے ہوئے مکاتب اور چھوٹے مدرسوں میں بھی جزئی طور پر یا بعض غیر اہم ترمیموں کے ساتھ جاری و ساری ہے

دوسرا قابلِ ذکر سلسلہ ندوۃ العلمار کا ہے جس کی بنیاد انیسویں صدی کے آخر میں سرسید کی علی گڑھ تحریک کے ردِّ عمل یا ایک خوشگوار اثر کے طور پر پڑی لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس اصول پر اس کی بنیاد پڑی تھی کہ قدیم وجدید کو آمیز کیا جائے تو منصوبہ سازی میں قدیم ذہن اس قدر حاوی رہا ہے کہ جدید کا کماحقہ تصور ہی پیدا نہ ہو پایا۔ اور نتیجہ میں معمولی پیوند کاری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکا۔ عربی ادب کا ذوق زیادہ عام ہو گیا۔ عربی بولنے کی مشق زیادہ ہو گئی اردو اخبار نویسی اور دینی علمی اداروں میں یہاں کے فارغ التحصیل طلبار کی کچھ کھپت ہونے لگی، لیکن اس کے آگے کچھ نہیں۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ اتنا ہو گیا کہ خود علمار میں ایک ELITE طبقہ پیدا ہو گیا۔ لیکن مجموعی طور سے کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ 'ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند اول آں بنیاد را ویراں کنند' رومی کے اس انقلابی تصور کا یہاں بھی کوئی سوال نہیں اٹھا!

تصنیفی صورت میں ہمارے مفکروں نے رائج نظام و نصاب کے سلسلہ میں اب تک جو کوششیں کی ہیں ان کو کچھ سراغ منتشر صورت میں شبلی (۱۸۹۴ء) ابوالحسنات ندوی (قدیم درسگاہیں ۱۹۲۱ء) مناظر احسن گیلانی، (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت ۱۹۴۰ء) اور آصف فیضی (مڈل ایسٹ جنرل ۱۹۵۴ء) کے یہاں مل جاتی ہیں۔

دو غیر معروف مگر زیادہ ہمہ گیر اور اہم منظم باقاعدہ اور شعوری کوششیں قابل ذکر ہیں: ایک جو جامعہ جوبلی (۱۹۴۶ء) کے موقع پر اسلامی دنیا کے مشہور عالم اور مفکر علامہ موسیٰ جار اللہ نے ذاکر صاحب کی فرمائش پر بالکل نیا نصاب مرتب کرکے اپنے تبصرے کے ساتھ پیش کیا۔ اور دوسرا جو مدرسہ عالیہ رام پور کی مشہور عالم اسلامی درسگاہ کے پرنسپل عبدالسلام خاں نے جو قدیم نصاب کو سامنے رکھ کے اور اس تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے اپنا اصلاحی نصاب (۱۹۴۱ء — ۱۹۵۱ء) مدلل اور مربوط نحو انگیز تبصرہ کے ساتھ پیش کیا۔

اور اس سلسلہ میں آخری کوشش سنٹرل وقف کونسل کا مجوزہ " جدید نصاب تعلیم مدارس عربیہ ہند کے لئے " کے نام سے ایک کتابچہ کی صورت میں میرے پیش نظر ہے جس کی ترتیب میں مولانا محمد طیب، مولانا عمران ندوی، مولانا سید علی نقی، پروفیسر آصف فیضی، پروفیسر اجمل خاں، پروفیسر عبدالوہاب بخاری، اسد اللہ کاظمی، مولانا محمد میاں فاروقی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی شریک رہے ہیں۔ یہ کام ۱۹۶۶ء میں انجام کو پہنچا ہے۔ اول الذکر نادر تجربہ اور آخر الذکر مقدمہ اکی تقریب شائع کر

مگر بنیادی طور سے مسئلہ اب بھی بحث کا محتاج ہے : علما کو زندگی کی دوڑ میں اپنے برابر شریک بنانا ہے اور عالم کا وہ تصور اپنانا ہے جو عہد زوال سے پہلے تھا ۔ یا بنیادی طور سے عالم دین پیدا کرنا ہیں اور کچھ لیپا پوتی کے ساتھ ۔ یا محض عالم دین پیدا کرنا ہے بیوند کاری کے بھی بغیر!!! ہندوستان اور بیرون ہند دونوں کی کوششیں اور افکار ہمارے سامنے ہیں ۔ ایک جگہ ٹھونکا پیٹی، مرمت اور پیوند کاری کا تصور غالب ہے جہاں بنیاد اب بھی مذہب ہی کو رکھا گیا ہے۔ دوسری جگہ انقلاب سے کم بات نہیں؟ اور بنیاد زندگی اور علم کو بنایا گیا ہے کیا توازن کی مزید راہیں نہیں نکل سکتیں؟

مقالات

مولانا عبدالسلام خاں رامپوری

پروفیسر مقبول احمد

جناب اخلاق احمد

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

پروفیسر محمد شفیع اگوانی

بحث

جناب سید اوصاف علی

مولانا عبدالرحمٰن کشمیری

مولانا سعید احمد اکبرآبادی

جناب علی اکبر ترمذی

مولانا عبدالسلام قدوائی

مولانا زید ابوالحسن فاروقی

پروفیسر محمد اجمل خاں

بیرسٹر نورالدین احمد

ڈاکٹر سعید انصاری

جناب عبدالحلیم ندوی

مولانا سید عبدالدائم جلالی

قاضی سجاد حسین

جناب عبداللطیف اعظمی

مولانا عتیق صدیقی

عابد رضا بیدار

پروفیسر عبدالعلیم

محمد عبدالسلام خاں[1]

قدیم اسلامی درسگاہوں کے نصاب کی اصلاح کے متعلق چند بنیادی باتیں

اسلام زندگی اور اس سے تعلق رکھنے والے تمام مسائل کو چند سادے اور بنیادی عقیدوں کی روشنی میں دیکھتا ہے اور ان کے تحت ہی ان کی قدریں متعین کرتا ہے مسلمان طرح طرح کے ظروف و حالات سے دوچار ہوتے رہے کہیں ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی تو کہیں ہم آہنگ بنانے کی تاہم ان کا انداز فکر ہر جگہ ہر زمانے میں اور ہر حال میں یکساں اور منفرد رہا۔ اس طرح ان میں ایسی ملت کی بنیاد پڑ گئی جو زبان و مکان اور نسل و قوم کے تعصبات سے پاک تھی مسلمانوں نے اپنی اس ملی انفرادیت کو قائم رکھنے کے لئے جو جو شعوری یا غیر شعوری کوششیں کی ہیں ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں پھر بھی ان کی اس کوشش کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اپنے ہر قسم کے اداروں کو اپنی انفرادیت کا مظہر

---

[1] پرنسپل مدرسۂ عالیہ رام پور، اقبال کا فلسفہ پر ۳۰، ۲۵ اہم مقالوں کے مصنف، جدید انداز فکر کے ساتھ قرآن مجید کی ایک تازہ تفسیر کے مؤلف

بنا کر ہی چھوڑا۔ زندگی کے جائز اور ضروری تقاضوں کو نظر انداز کرنے کے بجائے ان کو اپنے رنگ میں پورا کرنے کی کوشش کی اس طرح ماحول سے بے آہنگ بھی نہ ہوئے اور ملی انفرادیت بھی قائم رہی انہوں نے دوسروں کو جذب کیا لیکن خود کسی میں جذب نہ ہوئے۔ مسلمانوں کا یہ ملی شعور ان کے تمام اداروں پر برابر چھایا رہا ہے۔

امتِ اسلامیہ کا ادارۂ تعلیم ان کے ملی شعور کا سب سے زیادہ اہم مظہر رہا ہے۔ یہ ادارہ ایک طرف اس کے مذہبی تصورات اور عقائد سے سب سے زیادہ متاثر تھا تو دوسری طرف ان کی قومی تشکیل میں سب سے بڑی اثر انداز حیثیت رکھتا تھا۔ اس ادارے کا مقصد افراد کو ان کے ذوق اور استعداد کے مطابق زندگی کی گوناگوں وسعتوں کے لئے تیار کرنا اور ترقی پذیر گرد و پیش کو اپنے رنگ میں رنگین بنانے کی استعداد پیدا کرنا تھا مسلمانوں کی درسگاہیں ہر قسم کے علوم و فنون کا مرکز رہیں۔ علوم میں اپنے اور بیگانے کا امتیاز نہ تھا۔ یہ درسگاہیں حکومت کے ساتھ اور حکومت کے بغیر دونوں طرح چلتی رہیں اور اس طرح مسلمانوں کا تعلیمی ادارہ مسلمانوں کی زندگی کے جزو لاینفک کی حیثیت میں قائم اور برقرار رہا۔

چونکہ مسلمانوں کی ملی زندگی اور اس ادارہ کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے جوں جوں انکی ملی حیات میں جمود و اضمحلال آتا گیا ان کا ادارۂ تعلیم بھی ویسے ویسے جامد اور مضمحل ہوتا گیا۔ اگر ملوکیت کی بیش قدموں اور پیش پا افتادہ کاریوں اور تباہ کاریوں کی داستان کو ہی مسلمانوں کی مکمل داستان نہ سمجھ لیا جائے تو درحقیقت چوتھی پانچویں صدی سے ہی تاریخ کی اس بڑی اور اثر انداز مدت میں جمود اور اضمحلال پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا اور وہ ہر جہتی اور متناسب نمو اور ارتقا جو کسی قوم کو ہر طرح کے گرد و پیش میں ترقی پذیر اور متناسب بنائے رکھتا ہے اس کے دھارے خشک ہونا شروع ہو گئے تھے۔

یہ جمود اور اضمحلال کیسے اور کیونکر آیا اس کی داستان طویل ہے اور ہم میں سے بہتوں کے لئے تلخ بھی لیکن حقیقتوں سے صرف نظر بھی کب تک! مسلمانوں

کا مذہبی اور علمی تنزل بلکہ میرے نزدیک تو ان کا سیاسی اور اقتصادی زوال بھی اس داستان کا المناک باب ہے۔ میں تفصیلات میں پڑنا نہیں چاہتا تاہم کچھ اشارے بے محل نہ ہونگے۔

جونہی پانچویں صدی میں بعض عارضی عوامل سے متاثر ہو کر ہمارے فقہا نے فقہی اجتہاد کے دروازے بند کر دیئے۔ ممکن ہے کہ وقت کی مصلحتوں کا یہی تقاضا ہو اور ماحول اور ماحول کی اصلاح کا بھی واحد طریقہ ہو لیکن اس کے اثرات کی دور رسی اور ہمہ گیری کو غالباً یہ بزرگ پوری طرح محسوس نہ کر سکے۔ مسلمانوں کی پوری ملی حرکت کا محور دین تھا۔ دین کے خارجی پہلو یا اس کے معاشرتی رخ سے اجتہاد کو خارج کر کے جمود کو دعوت دینا ایک طرح سے انکی ملی حیات کو جامد بنا دینا تھا۔ زندگی کے تمام شعبے جامد ہونے شروع ہو گئے علوم و فنون کی حرکتیں سست ہو گئیں۔ اگلوں کا ضروری احترام بیجا عصبیت میں بدل گیا۔ غلطیاں کر سکنے والے تمام علماً معصوم بن گئے۔ جدت افکار گویا ناپید ہو گئی اہل علم کی دماغی ابجوں نے فکری جولانیوں کے لئے اس قید و بند میں بھی نئے میدان تلاش کرنے شروع کر دیئے جو پچھلوں کے لئے شمع راہ ہونے کے بجائے رستے کے روڑے ثابت ہوئے۔ اس کے مختلف النوع مظاہر کی تفصیل و تفتیش کا یہ موقع نہیں تاہم اس کا تعلیمی اور تصنیفی مظہر سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ جدت فکر کی بے راہ روی نے نئی پگڈنڈیاں نکالیں۔ متقدمین کے استنباط کئے ہوئے مسائل چیستان بنے اور چیستانوں کے حل دریافت ہوئے اور حلوں کو معمہ کیا گیا۔ اعتراض اور جواب، توثیق و تردید اور توجیہہ و تعلیل کی تہیں جمتی گئیں۔ اگلوں کی کلیات استقرا اور استنباط سے پچھلوں کو بے نیاز کر دیا۔ اس تاریک فضا میں اگر کسی منچلے دماغ نے کوئی چمک محسوس کی تو معاصرین اور متاخرین کی کج بحثیوں نے اس پر دھند پھیلانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ زمانے کو قدامت سے بیر ہے۔ لوگوں نے پچھلوں کی پذیرائی کی اور اگلوں کے کاموں کو کتاب خانوں میں بند کر کے طالبان فن سے اجتہادی نمونے بھی چھین لئے اور

پچھلوں کی جامد تالیفیں ان کی رہنمائی کے لئے رہ گئیں۔ ہمارے نصاب کی کتابوں پر نظر ڈال لیجئے قریب قریب سب کتابیں مسلمانوں کے عہد جمود کی یادگاریں ہیں۔ متن شرح اور حاشیئے کا ایک چکر ہے جس میں نہ علم کی انفرادیت قائم ہے نہ مضمون کی جامعیت۔ نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کس کس کا کیا کیا حصّہ ہے کس کس کی فرد گزاشتیں ہیں اور کس کس کی اصلاحیں۔ طرز تعلیم لیجئے تو محض کتابی، نہ زندگی سے مربوط نہ مقصد سے چسپاں، خود قناعتی جمود حقیقتوں سے اغماض اور کج بحثی تو ہمارے مدارس کی گویا خصوصیتیں ہیں۔

علوم اور فنون کے جمود نے مسلمانوں کے سب سے اہم قومی ادارے تعلیم کو جامد بنا دیا اور وہ درسگاہیں جو زندگی کی نشوونما میں سب سے زیادہ قابلِ قدر حصّہ لیتی تھیں زندگی سے دور ہوتی چلی گئیں۔ لیکن یہ دوری بہت دنوں تک محسوس نہ ہو سکی۔ اتفاق سے مشرق میں خود زندگی بہت دنوں تک ساکن اور جامد رہی اور ہماری درسگاہیں اپنے ڈھرّے پر رہتے ہوتے بھی صدیوں تک زندگی کی ہم آہنگی کرتی رہیں۔ مغرب اور مشرق کا تصادم ہوا اور مشرق میں پہلی بار زندگی نئے افکار نئی اقدار اور نئے تقاضوں کے ساتھ نمودار ہوئی ہماری درسگاہیں نہ وقت کے ان نئے تقاضوں کو پورا کر سکتی تھیں نہ ان نئی فکروں اور نئی قدروں کا مقابلہ کر سکتی تھیں چنانچہ ہماری درسگاہوں کو اپنی ہر جیتی ختم کرنی پڑی اور آہستہ آہستہ انہوں نے اپنے زاویے کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ علوم و فنون میں دینی و دنیوی کی تقسیم قبول کر کے اپنے آپ کو دینی علوم کی تعلیم میں محدود کر لیا۔ اس تدبیر سے تقریباً ایک صدی سے زیادہ عرصہ زندگی سے بچتے بچتے گذر گیا۔ لیکن جس طرح زندگی سے الگ کر کے عام علوم و فنون کی تعلیم بہت دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتی ہے اسی طرح خالص دینی تعلیم کو بھی زندگی سے بچا کر باقی نہیں رکھا جا سکتا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ وہ گوشۂ عافیت بھی تنگ ہونا شروع ہو گیا جس کو ہماری درسگاہیں قلعہ بند سمجھے ہوئے تھیں۔

یہ ہوسکتا ہے بلکہ ہے بھی یہی کہ ماحول اور فضا کافی مسموم ہوچکی ہے لوگوں کو دین سے وہ لگاؤ نہیں ہے جیسا ہونا چاہیئے۔ اسلامی مدارس کی تعلیم اور تربیت سے بُعد بڑھتا جارہا ہے دینی عقائد و تصورات میں وہ قوت باقی نہیں رہی ہے جو امت مسلمہ کو زندگی کے میدان میں منظم اور منضبط رہ سکے لیکن اس کی ذمہ داری صرف دوسروں پر ہی نہیں ہے کچھ قصور ہماری درسگاہوں بھی ہے۔ ہماری درسگاہوں نے زندگی کو ایک کل کی صورت میں دیکھنا چھوڑ دیا۔ زمانے کی عقل کو ناقابلِ اعتنا قرار دیا۔ عصری علم و فنون سے دیدہ دانستہ اغماض کیا اور اس طرح زندگی سے کٹ گئیں۔ ہمارے علماء کا فرض تھا کہ وہ حالات کا صحیح جائزہ لیتے اور حقیقی علل و اسباب کو دریافت کرتے اور جب مرض متعین ہوجاتا تو صحیح علاج کی طرف متوجہ ہوتے اور طبیب حاذق کی طرح ہر وقت مرض اور علاج کی مطابقت پر نظر رکھتے لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ برخلاف ازیں انھوں نے محض دوسروں کی کوتاہیوں سے اپنی اور اپنے اداروں کی کمیوں کی تلافی کرنی چاہی۔

مسلمانوں کی ملی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے ان کی تعلیم و تربیت کی انفرادیت کو قائم رکھنا ضروری ہے اور یہ بغیر اسلامی درس گاہوں کے ممکن نہیں ہماری آج کی اسلامی درسگاہیں پرانے عربی کے مدرسے ہیں اور یہی ہماری اس ملی حیات کی نمائندگی کر رہے ہیں جس کی شیرازہ بندی مذہب کرتا ہے۔ ان مدرسوں کے علاوہ مسلمانوں کے اور جتنے ادارے ہیں یا قومی اور وطنی زندگی کو پیش کرتے ہیں، یا دوسرے عصری محرکات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان مدرسوں کا حال یہ ہے کہ ان کا نصاب طرزِ تعلیم ان کے اساتذہ کا اندازِ فکر ان کے طلباء کا اندازِ نظر سب کے سب زندگی سے دور اور تعمیری قوتوں سے ناآشنا معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے علماء نے یا حالات کی قوت کو محسوس نہیں کیا یا راضی بقضا ہیں۔

زندگی اپنا چولا بدل چکی۔ علوم و فنون بدل گئے۔ مسائل دوسرے ہو گئے

طرز فکر اور انداز نظر نیا ہو گیا۔ ہر چیز قانون ارتقا کے تحت ماضی سے بہت آگے نکل گئی دنیا کے جن جن اداروں نے زندگی کا ساتھ دیا اور اس کی ارتقا میں اپنا واجبی حصہ ادا کیا وہ باقی رہے اور ترقی کرتے رہے، جو ادارے زندگی کا ساتھ نہ دے سکے انہیں ختم ہونا پڑا۔ کائنات کی ترقی پذیر روح حیات کو جذب کئے بغیر کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہماری ان پرانی درسگاہوں نے بد قسمتی سے قدرت کے اس اٹل قانون کی خلاف ورزی کی اس لئے یا فنا ہو گئیں یا فنا آمادہ ہیں۔ ان کو ان کی موجودہ حیثیت میں باقی رکھنے کی ہر کوشش لا حاصل ہے۔ ان کا کام ختم ہو گیا۔ ان میں پڑھائے جانے والے علوم فرسودہ ہو گئے۔ طریقۂ تحقیقی اور طرز تعلیم دونوں بوسیدہ ہیں۔ نہ یہ ہماری خارجی زندگی سے ہم آہنگ اور نہ داخلی حیات سے مطابق ان میں اسلام کے حقیقی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت بھی نہیں۔ زندگی کو اسلامی اصول پر متوازن بنانے کے لئے جن قابلیتوں کو ضرورت ہے ان کو پیدا کرنے سے یہ قاصر ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا باقی رہنا کرامت ہو سکتا ہے تاریخ کا تقاضہ نہیں۔ اس بدلی ہوئی فضا میں ان کو باقی رکھنے کی بڑی سے بڑی کوشش ان کی رفتار زوال کو کچھ سست کر سکتی ہے زندگی نہیں پھونک سکتی۔

تاہم اگر ان مدارس کو پرانے انداز پر ہے باقی رکھنا ہے تو پھر وہی تدبیر کرنی ہوگی جس کو اب سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے آزمایا گیا تھا۔ ان مدارس کو اور زیادہ نیچے لانا پڑے گا اور کمیت کے ساتھ کیفیت کو بھی محدود کرنا ہوگا نصاب کو بہت زیادہ ہلکا کرنا پڑے گا۔ تعلیمی گھنٹوں میں کافی کمی کرنی ہوگی۔ اوقات میں تبدیلی کی جائے گی اور مدت تعلیم کو کم کیا جائے گا۔ تاکہ مذہبی تعلیم کے شائق (اور خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں) اپنے غیر مصروف گھنٹوں میں دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ دو تین سال میں مذہبی نصاب کو ختم کر سکیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ ایسے خصوصی ذوق اور اچھی صلاحیت والے افراد نکل آئیں جو اس تعلیم کی اپنے طور

پر تکمیل کر کے ہمارے موجودہ علمار کی جگہ لے سکیں۔

اس تدبیر سے ہم اپنی موجودہ درسگاہوں کو کچھ زمانے کے لیئے آباد کرلینگے اور مذہبی تعلیم کا چرچا کچھ دنوں تک مزید برقرار رہے گا کیونکہ یہ محض عارضی تدبیر ہے جو موجودہ ماحول کو دیکھتے ہوئے شاید پیش رو تدبیر سے بھی کم دیرپا ثابت ہوگی اور ہمیں چار و ناچار یا ان مدارس کو مستقلاً بند کرنا پڑے گا یا پھر کوئی دوسری تدبیر کرنی ہوگی۔ کیونکہ آج کل ظروف وحالات جس تیزی سے کے ساتھ بدل رہے ہیں اور ان کی تبدیلی کے ساتھ ذہنیتوں میں جس سرعت کے ساتھ انقلاب آتا جارہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس قسم کی عارضی تبدیلیاں بہت زیادہ وقتی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

ہاں اگر ہمارا مطمح نظر انداز اور طرز نہیں ہیں اور ہم علوم وفنون کو انہی پر منحصر نہیں سمجھتے ہیں جو متاخرین سے ہمیں ورثے میں پہنچے ہیں بلکہ ہمارا مقصود اسلامی ادارۂ تعلیم کو برقرار رکھنا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ مسلمانوں کی انفرادی اور معاشرتی زندگی کو وہ کیسے ہی حالات وظروف میں ہو اسلامی بنایا جاسکے اور مذہبی اصول کو بنیاد بناکر مسلم زندگی کی تنظیم کی جائے تو پھر اس کے لئے وہ طریقے اختیار کرنے ہوں گے جن کو مسلمانوں نے اپنے عہد ترقی میں اختیار کیا تھا مدرسوں میں عصری روح جذب کرنی ہوگی۔ قدیم فرسودہ علوم وفنون کے بجائے علوم وفنون کو انکی ترقی یافتہ شکل میں شامل کرنا ہوگا۔ تعلیم کو زندگی سے مربوط کرکے آگے بڑھانا ہوگا۔ ان درسگاہوں کا دینی پہلو یہ ہوگا کہ طلبار کو اسلام کی حرکی قوتوں سے آشنا کریں گی۔ اسلام کی بنیادی قدروں سے زندگی میں کس طرح ضبط پیدا کیا جاسکتا ہے یہ درسگاہیں اس کو سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت پیدا کریں گی۔

غالباً صرف یہی ایک طریقہ ہے کہ جس سے اسلام کے تعلیمی ادارے کو باقی رکھا جاسکتا ہے اور اسکو مسلمانوں اور خود اسلام کے لئے مفید بنایا جاسکتا ہے اور تنہا اسی قسم کی درسگاہوں کے فضلاسے زندگی میں رہنمائی کی توقع ہوسکتی ہے چونکہ یہ درسگاہیں زندگی سے بیگانہ نہیں رہیں گی اس لئے وہ شاید زیادہ دیرپا اور

مستقل ثابت ہوں۔ یہ طریقہ ایک بار کامیاب ہو چکا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اب ناکام ہو۔ اور اگر خدانخواستہ ناکام ہوا تو بھی ممکن ہے کہ اس تجربے کی بنا پر ہم زیادہ بہتر اور زیادہ عملی راہوں کا سراغ پا سکیں۔ لیکن اگر کچھ بھی نہ ہو سکا اور اصلاح کے شوق میں ہماری موجودہ درسگاہیں جاتی رہیں تو یہ ایسی بات ہے جو ہونی ہے اس لئے خوفزدہ ہو کر ہمیں صحیح سمت میں کوششیں نہ چھوڑ دینی چاہئیں کیونکہ تسکین کے لئے یہ بھی کیا کم ہے کہ ہم نے اپنی جیسی کر لی۔

ہمارے مدارس کی اصلاح کے سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ تحقیق کرنی ہے کہ ہمارے نصاب تعلیم کا وہ خاص ڈھانچ کونسا ہے جو اسلامی مدارس میں سدا حاصل ہے کونسے مضامین لازم کی حیثیت رکھتے ہیں اور کونسے اختیاری ان مدارس کی تعلیم اور تربیت کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟ ان امور کی صحیح تحلیل کر لی جائے تو ممکن ہے کہ اصلاح کے لئے صحیح رستے مل جائیں۔

تذکروں اور تاریخوں نے ہمارے مدارس کے نصاب کے بارے میں جو کچھ محفوظ رکھا ہے اس سے اور مختلف علوم و فنون کی ان تصانیف سے جو ہم تک پہنچی ہیں یہ قیاس کرنا بیجا نہیں کہ ہمارے تعلیمی اداروں کی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ انہوں نے دین کو اساس بنا کر تعلیم کی عمارت کو استوار کیا اور ہر طرح کی فکری اور عملی کوششوں کو دین کے سانچے میں ڈھال دینے کی کوشش کی۔ اصل خالص مذہبی رکھ کر اس میں علوم و فنون کی رنگ آمیزیاں کیں۔ مذہب کے تفوق کو نمایاں کیا۔ اس طرح اگر ایک طرف مسلمانوں کے علوم و فنون مذہب سے متاثر ہوئے تو اس میں بھی شبہ نہیں کہ دوسری طرف مذہب نے بھی بعض اجنبی اثر قبول کئے۔ تاہم مسلمانوں نے اس کی پرواہ نہ کی اور اس ڈھانچ کو جو زمانے نے ان کی تعلیم کے لئے مقرر کر دیا تھا کسی طرح نہ چھوڑا۔ ہماری درسگاہوں کا بھی مخصوص ڈھانچ ہے جو ان کو دوسری درسگاہوں سے ممتاز بناتا ہے۔

مسلمانوں کے نصاب تعلیم کے صدہا سالہ مسلسل تغیرات پر اڑتی سی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دینیات اور عربی کو چھوڑ کر ہمارے نصاب کے تمام دوسرے

مضامین میں پیہم ردو بدل اور متواتر حذف و اثبات ہوتا رہا ہے اور یہ استثنا بھی ابتدائی اور متوسط نصاب میں ہے۔ نصاب تعلیم کے اعلیٰ مراحل میں یہ استثنا بھی نظر نہیں آتا۔ تفقہ فی الدین اور عربی کی لسانی مہارت طلبار کے ذوق مناسبت طبع اور فرصت اور حالات کی مساعدت پر منحصر رہی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دین سے اوسط درجے کی عام واقفیت پیدا کرانی جس سے اسلام کے عقائد و اعمال واضح ہو جائیں اسلام طرز زندگی کا علم ہو جائے اور معاشرے کی روز مرہ کی ضرورتیں پوری ہو سکیں، ہمارے مدارس کا مطمع نظر تھا اس سے زیادہ کی تعلیم کو یہ ادارے نہ ضروری سمجھتے تھے اور نہ مناسب۔ ان اداروں کو عربی سے جتنی دلچسپی تھی اس کی حدیں مقرر تھیں یہ درسگاہیں اپنے طلبار کو اس قدر عربی سے لازماً آشنا بنا دیتی تھیں جس سے وہ قرآن و حدیث سے بطور خود اور بلا واسطہ فائدہ اٹھا سکیں، اور اسی ضمن میں فقہ و اصول اور عقائد و کلام کی کتابوں کا براہِ راست مطالعہ کر سکیں۔ عہدِ جاہلی کی ادبی عربی اپنی تمام لسانیاتی نزاکتوں اور فصاحت اور بلاغت کے نکتوں کے ساتھ قرآن کے اسلوبِ بیان، اعجاز ادا اور تدبر معانی کے لئے ضروری سہی اور بحیثیت عربی اہل زبان کے اختلاط و تعلق کے لئے ناگزیر سہی لیکن ہماری درسگاہوں نے اپنے عام متوسط نصاب کا انکو جزو لازم نہیں بنایا بلکہ خصوصی ذوق اور شخصی ضرورتوں پر محول رکھا۔

اسلامی درسگاہوں کی تربیت کی امتیازی خصوصیت یہ رہی کہ وہ طلبار میں اسلامی کردار کو نشو و نما دیں اُن کے افکار، اخلاق و اعمال کو اسلامی نمونے کے مطابق ڈھالیں، چنانچہ صالح ماحول اسلامی کردار کے اساتذہ اس تربیت کے لئے ضروری عناصر سمجھے گئے ہیں۔ غرض یہ کہ ہماری درسگاہوں کی تربیت کا مقصد صرف اچھے اور مفید شہری بنانا نہیں رہا ہے بلکہ اچھے اور مفید مسلمان بنانا رہا ہے اور تنہا یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے مسلمانوں کو اپنی مستقل درسگاہوں کی ضرورت ہے

اسلامی درسگاہوں کے امتیازی اوصاف کی اگر یہ تحلیل درست ہے تو ان کو

سامنے رکھ کر ہی ہمیں اپنے ان مدارس کی اصلاح کرنی چاہیئے۔ جہاں تک مقصد اور ترتیب کا تعلق ہے جب تک ہماری درسگاہوں کو ایسے اساتذہ میسر نہ آجائیں جو خود اس رنگ میں رنگے ہوں اس وقت یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم اپنی درسگاہوں میں مقصد اور تربیت کے اعتبار سے سو فی صدی کامیاب ہوں گے تاہم اس سلسلے میں جو کوششیں ہو سکتی ہوں ان سے دریغ نہ کرنا چاہیئے اور جو مسائل مفید ہوں ان کو اختیار کرنا چاہیئے۔

ابتدائی اور متوسط نصاب میں دینیات اور عربی کو لازم قرار دیا جائے اور اعلیٰ اور تکمیلی نصاب میں ان کو اختیاری مضامین کی حیثیت میں پڑھایا جائے اور حتی الامکان ان درسگاہوں کو ہر جہتی بنانے کی کوشش کی جائے۔ پرانے علوم آج اتنے ترقی کر چکے ہیں کہ جدید و قدیم میں نام کے علاوہ شاید کوئی اشتراک نہیں۔ فہرست علوم میں سیکڑوں نئے علموں کا اضافہ ہو گیا۔ ہماری درسگاہوں کو حسب مقدرت ان سب کو شامل کرنا چاہیئے اور ایسے تمام علوم و فنون کو جو آج محض قدیم نظریوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور صرف تاریخی اہمیت کے حامل ہیں ان کو عام نصاب سے خارج کیا جائے ان کی صحیح جگہ ہمارے مدارس میں کہیں ہے تو تخصص کے مرحلے میں اور وہ بھی اختیاری حیثیت میں۔

یہ سچ ہے کہ ہماری عام درسگاہیں موجودہ فنون کی تعلیم کا بار اٹھانے کے قابل نہیں لیکن ابتدائی اور ثانوی مرحلوں تک بہت سے مدرسے اگر چاہیں تو جدید تعلیم کا بار اٹھا سکتے ہیں ہندوستان کے بعض بڑے مدرسے کوشش کریں تو کم از کم نظری فنون کو جامعی معیار تک بھی پڑھا سکتے ہیں۔ اس طرح جب نئی منہاج کی بنیاد پڑ جائے گی اور نئے فنون ہماری درسگاہوں میں بار پالیں گے تو کون کہہ سکتا ہے کہ علمی فنون کی راہیں نہیں کھلیں گی اور خدا ان کے لئے اسباب مہیا نہیں کرے گا۔ میرا خیال ہے کہ مذہبی تعلیم میں جذب کی ہوئی عصری تعلیم ہماری درسگاہوں کی معرفت کافی سستی اور زیادہ مفید ثابت ہوگی۔ زبان کا مسئلہ بھی اب زیادہ دشوار نہیں ہے عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ نے کام چلانے کے لئے اردو میں کافی مسالہ جمع کر لیا ہے جس سے اگر چاہیں

توبھارت میں تنہا ہی فائدہ اٹھاسکتی ہیں اور یوں حکومت سے آزاد رہ کر اردو کی ٹھوس خدمت بھی انجام دی جاسکتی ہے۔

پوری تعلیم کو ایک اکائی کی صورت میں ضبط کرنا نہ طلباء کے لئے مفید ہے اور نہ سرپرستوں کے لئے خالص تعلیمی زاویۂ نظر بھی اس طریق کار کی تائید نہیں کرتا۔ تعلیم کو چند اور مکمل بکار آمد مرحلوں میں تقسیم ہونا چاہیئے۔ ابتدائی مرحلوں کو چھوڑ کر ثانوی اور جامعی مرحلوں میں طلباء کی ضرورتوں اور مناسبتوں کے تحت اختیاری مضامین کی مجموعہ بندیاں کرنی چاہئیں تخصص اور مہارت پیدا کرنے کی سہولتیں بہم پہنچانی چاہئیں اس کے بغیر ہماری درسگاہیں ہرجہتی اور مفید نہیں بن سکتیں۔ مضامین کی تقسیم مجموعہ بندی اور طریق تعلیم میں عصری تحقیقوں اور ماہرین تعلیم کی رایوں اور منصوبوں سے کام لینا چاہیئے اس طرح ہم بہت سی کاوشوں سے بھی نجات پالیں گے اور ہمارا نظامِ تعلیم خود بخود دین کی اور عصری روح سے ہم آہنگ رہے گا۔

ہماری درسگاہوں کے مروجہ دینیاتی نصاب میں قرآن کو عملاً مرکزی حیثیت حاصل نہیں حالانکہ اسلام کو سمجھنے اور اس کا عام میلان و مزاج دریافت کرنے کا واحد ذریعہ قرآن ہی ہے قرآن میں بلاواسطہ تدبر کی راہیں بڑی حد تک بند ہیں آئندہ نصاب میں اس کو مرکزی مقام ملنا چاہیئے اور بلاواسطہ تدبر کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے۔ احادیث کا دورہ حنفی اور اشعری کلام کی روشنی میں پورا کردیا جاتا ہے اور اس طرح احادیث کی تمام دوسری حیثیتیں نظرانداز ہو جاتی ہیں احادیث کو جب تک شرح قرآن کا درجہ نہیں دیا جائے گا ان کی تعلیم کا صحیح فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ فقہ آج تقلیدِ محض ہے تعلیم کے آخری مرحلوں میں حقیقی تفقہ پیدا کرنا ہمارے نصاب کا مطمع نظر ہونا چاہیئے۔ اصولِ فقہ کا درس بالکل بے مقصد ہو گیا ہے اس کو بامقصد بنانا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے عقائد و کلام میں مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر عجیب و غریب عقائد اور دور از کار نظری مباحث شامل ہو گئے ہیں جو ممکن ہے کبھی مفید اور ضروری ہوں مگر آج ان کی وجہ سے اسلامی عقائد کی سادگی چھپ جاتی ہے اور اس زمانے کے ذہن کے لئے طمانیت بخش ہونے کے بجائے الجھنوں کا

باعث ہیں۔ دینیات کے لئے جدید نصاب پر غور کرتے وقت ان سب باتوں پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارا نصاب اسلامی رجحانات سے مناسب رکھنے کے ساتھ ساتھ جدید ماحول کی ضرورتوں کو بھی پیدا کر سکے۔

دوسرے فنون کی تعلیم میں تاریخی پس منظر کے طور ان خدمتوں کو جو مسلمانوں نے انجام دی ہیں نمایاں کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ مغربی تاریخ علوم میں جو خلا ہے بھر جائے اور اس لئے بھی کہ ہماری موجودہ تعلیم اپنے ماضی کے ساتھ مربوط رہے۔ اس طرح نہ ہم اپنے اسلاف سے بیگانے رہیں گے اور نہ ہماری ملی وحدت زمانوں اور عصروں سے پارہ پارہ ہوگی۔

ہمارے مدارس میں ابتدا سے بعض ایسے مضامین درس میں شامل ہیں جو ابتدائی موقف میں بالکل بے کار ہیں اور ان میں طلبا کی قوت بے جا صرف ہوتی ہے ایسے مضامین کو ابتدائی مراحل سے خارج کر دینا بہتر ہے ان کا درس بشرطِ ضرورت صحیح موقعوں پر ہونا چاہیئے۔ معانی، بیان، اصولِ فقہ، منطق اور فلسفہ اس قسم کے مضامین ہیں، صرف ونحو ابتدائی مرحلے کے لازم مضامین ہیں مگر ان کی مجرد حیثیت میں تعلیم طلبا پر غیر ضروری بار ہے۔ ان کی تعلیم زبان کے ضمن میں ہونی چاہیئے یوں طلبا دلچسپی بھی محسوس کریں گے اور زبان کے ساتھ قواعد کی مشق بھی ہو جائے گی۔

زیرِ درس مضامین میں اصل اہمیت علوم کو دینی چاہیئے نہ کہ کتابوں کو کیونکہ کتابوں کی حیثیت ان یادداشتوں سے زیادہ نہیں جن میں اساتذہ اور طلبا کی سہولت کے لئے متعین معیاروں کے تحت علمی مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ بغیر خاص ضرورت کے کتاب کو موضوع درس بنانا تعلیم کو ناقص بنانے کے مترادف ہے۔

تعلیم میں اس کی خاص طور پر نگرانی کی ضرورت ہے کہ تعلیم کا موضوع طالب علم رہے۔ تعلیم میں اس کی ضرورتوں، دلچسپیوں اور مناسبتوں کا خیال رکھا جائے اس کی ذہنی الجھنوں اور کشمکشوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور ان کو حل کرنے اور دور کرنے پر توجہ صرف کی جائے۔ تعلیم کا فائدہ طالب علم کے انفرادی اور اجتماعی رجحانوں کو ابھار کر اس کو سماج کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور بکار آمد

بنانا ہے تاکہ اس کو علوم کی کال کوٹھری بنانا۔ اسی ضمن میں بھی یہ ضروری ہے کہ طلبا میں تعمیری نقد کی حوصلہ افزائی کی جائے اس طرح نہ صرف یہ کہ اس کی تخریبی قوتوں کی اصلاح ہوگی بلکہ اس کی داخلی الجھنوں کی بھی تسکین ہوتی رہے گی اور دماغی اپج میں ترقی بھی۔

اس سلسلے کی آخری گزارش مدارس کے ارباب انتظام سے یہ کرنی ہے کہ اگر ہندوستان کے محکمۂ تعلیم کے منظور کئے ہوئے مراحل اور انکے بنائے ہوئے نصاب کو معیار بنا کر ضروری حذف و اثبات سے ان میں دینیات کو جذب کر دیا جائے اور میرا یہ تجربہ ہے کہ یہ کچھ زیادہ دشوار نہیں تو بہت سی کاوشوں سے نجات مل جائے گی اور ہمارا نصاب خود بخود زمانے کے ساتھ چلنے لگے گا۔ اساتذہ کا مناسب انتخاب تعلیم اور طرز تعلیم کی نگرانی طلبا میں اسلامی روح پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔

ابتدائی مراحل میں اساتذہ کی تھوڑی سی توجہ سے عربی اور دینیات کو ایک دوسرے میں جذب کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی مراحل میں عربی کو لازم کرنے کا مقصد طلباء کو ابتداء ہی سے ایسا ذریعہ فراہم کر دینا ہے جس سے وہ دینیات کے ماخذوں سے براہِ راست اور بقدر استعداد فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر قرآن حدیث اور فقہ و عقائد سے الفاظ فقروں، جملوں اور عبارتوں کا انتخاب کر کے عربی کی تعلیم دی جائے تو یہ فائدہ بدرجہ اتم حاصل ہو جائے گا" اور زبان کے اعتبار سے بھی عربی اتنی ہو جائیگی کہ آئندہ مراحل میں ادبی عربی کے لئے درجات کا کام دے۔

آخر میں مجھے ایسے تمام بزرگوں اور رفیقوں سے جنکو میری معروضات سے دکھ پہنچا ہو یا انہوں نے سوء ادب محسوس کیا ہو میں معافی چاہتے ہوئے عرض کروں گا کہ میری نیت نہ دکھ دینا ہے اور نہ سوء ادب کا ارتکاب۔ "ان ارید الا الاصلاح و ما توفیقی الا باللہ۔"

٭

محمد عبدالسلام خاں

ہندوستان کے اسلامی مدارس پر ایک نظر

ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی اسلامی مجالسِ درس قائم ہو گئیں تھیں۔ ان مجالس میں ابتدائی صرف و نحو کے بعد عام طور پر فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ قرآن و حدیث ہندوستانی مجالس درس کے لئے ایک حد تک غیر مانوس تھے۔ تبرکاً بعض اساتذہ حدیث کی دو ایک کتابیں بھی پڑھا دیتے تھے۔ علوم آلیہ میں نحو و صرف اور دوسرے لسانی علوم کی بہت معمولی تعلیم ہوتی تھی۔ صوفیہ کی مجالس میں تصوف کا زور تھا مگر غالباً نظری اور عملی تصوف کی اعلیٰ اور مستند کتابوں کے چرچوں سے ان بزرگوں کی محفلیں بھی خالی ہی ہوتی تھیں۔

ہندوستان میں علومِ دینیہ

فقہ اور اصولِ فقہ کی تعلیم میں نہ اجتہاد و استنباط کو دخل تھا اور نہ فروع کے اصول پر انطباق کو۔ ہندوستان کی آب و ہوا کا اثر کہیے یا علماء ماوراء النہر کا طرزِ تفقہ جن کے توسط سے فقہ و اصول ہندوستان میں پہونچے تھے کہ یہاں شخصیت پرستی اور اُب عن جدٍ متوارث خیالات اور اوہام

نہ صرف عوام کے دماغوں پر مسلط تھے بلکہ خواص اور حاملین عوام بھی اس سے بچے ہوئے نہ تھے۔ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت میں سب سے بڑا دخل صوفیا کے اثر کو ہے۔ صوفیائے مقدس طبقہ اپنی صلح کل اور ہر شخص کے ساتھ حسن ظن رکھنے کی حکمت عملی پر قائم رہنے میں اور متصوفانہ خیالات اور تاویلات کی پذیرائی میں سب سے آگے رہا ہے۔ صوفیہ کی یہ عام ذہنیت منفی طور پر ایک حد تک اس بات کا سبب بن گئی کہ اسلامی عقائد اور اعمال غیر اسلامی اوہام و مراسم سے صاف نہ ہو سکے اور لوگوں میں تنقید و اجتہاد کی طرف کوئی میلان پیدا نہ ہو سکا۔ مزید براں اسلام کے اصل اصول یعنی قرآن اور حدیث کی طرف نیز ان کے مقدس شارحین صحابہ و تابعین کے اعمال و اقوال کی طرف خاص توجہ نہ تھی۔ لہٰذا مسائل کا اصول پر پیش کرنا ممکن بھی کس طرح ہو سکتا تھا۔ اہل سنت کے مذاہب اربعہ میں سے صرف حنفی اصول و فروع سامنے رہے۔ دوسرے ائمہ کے اصول و فروع سے صرف اتنا تعلق تھا کہ انکی تردید کرنے کے لیے حنفی کتابوں میں جستہ جستہ ان کا ذکر آ گیا ہے ایسی حالت میں چیزوں کا یکطرفہ رہنا ناگزیر تھا چنانچہ قوت انتقاد و اجتہاد کے ابھرنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ معدودے چند افراد کو چھوڑ کر ہندوستان کی عام تصنیفیں اس جامد اور غیر تنقیدی نقل و تقلید کی آئینہ دار ہیں۔

قرآن و حدیث اور صحابہ و تابعین کی سیرتیں اصول کی حیثیت میں ہندوستان کے علماء کی نظر میں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اپنی حقیقی اہمیت حاصل نہیں کر سکی تھیں اور ان کی اس طرح کی خدمت نہیں کی گئی تھی جس طرح کی خدمت کی یہ چیزیں مستحق تھیں لہٰذا جس طرح اسلام کی عملی فروع کا انطباق اسلامی اصول پر نہ ہو سکا اسی طرح اسلامی عقائد بھی اپنے اصول استنباط پر منطبق نہ ہوئے چنانچہ جب علم العقائد و کلام کی طرف ان کی توجہ ہوئی تو عقائد کے نام سے ایسا مجموعہ سامنے آیا جس میں بہت سے دور از کار خیالی مبادی داخل ہو چکے تھے جن کو متکلمین نے فلسفۂ یونان کے مقابلے کی ضرورت سے تعلیم کیا تھا۔ ان فروعات پر عقائد کا مدار رہا اور ان کو اصول سمجھ کر دوسری غیر اسلامی چیزیں بھی انہی پر قیاس کی جانے لگیں۔ اس طرح ان عقائد

کے علاوہ جو ان کتابوں میں مذکور تھے بہت سے مزید خیالات نے اعتقادیاتی حیثیت اختیار کرلی۔ کلامی مباحث اور نظریۂ متاخرین کے توسط سے ہندوستان میں رواج پذیر ہوئے اور ان کی لفظی بحثیں اور "ان قیل قلت" کی بے معنی بھول بھلیاں سامنے آگئیں۔ نظریات و خیالات کی اصل بنیادیں اور ضرورتیں جن پر یا جن کی وجہ سے یہ نظریے اور خیالات تسلیم کئے گئے تھے آخریں نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئے لہٰذا ان سے اگر کوئی حقیقی فلسفیانہ فائدہ ہوتا بھی تو ایسی حالت میں نہیں ہوا۔ علمِ کلام کی ضرورت عقائدِ اسلامیہ کو مخالفین سے اس طرزِ خیال کے مطابق منوانا تھا جس کے وہ عادی تھے۔ یہ ضرورت اس لئے تو مسلم تھی کہ کتابوں میں لکھی تھی لیکن چونکہ ان سے مجتہدانہ کوئی سروکار نہ تھا اس لئے ان پر نظرِ ثانی کی یا ازسرِ نو غور کرنے کی ضرورت کا احساس نہیں ہو سکتا تھا۔

ہندوستان میں علوم عقلیہ علوم عقلیہ کا داخلہ ہندوستان میں مغلیہ دورِ حکومت میں ایران کے راستے سے ہوا۔ اہلِ ہند کے لئے یہ علوم نئے تھے۔ پورے انہماک کیساتھ ان کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن یہ ان کی قسمت تھی کہ ہندوستان میں ایرانی متاخرین کی کتابیں ان کی مرعوب کن شخصیت کیساتھ آئیں، چنانچہ انہیں متاخرین کی کتابیں ہندوستانی درس میں مقبول ہو گئیں اور اس طرح بجائے مختلف نظریوں سے روشناس ہونے کے ہمارے حصے میں صرف لفظی بحثیں، بے مقصد اور بے معنی نکتہ آفرینیاں رہ گئیں اور تلخیص و تشریح اور تحشیہ در تحشیہ کا بگڑا ہوا مذاق پیدا ہو گیا۔ ان علوم میں بھی اجتہادی اور انتقادی کام سے ان کی عقلی قوتیں محروم ہو گئیں۔ ان کتابوں کی بنا محض قیاسات اور اٹکل پچو کلیات پر تھی اس لئے انکی تجربی قوتوں کو کسی قسم کی مشق نہ ہو سکی بلکہ متاخرین کے عام سلسلۂ فکر کی تقلید میں تجربے کی اہمیت ہندوستانی طلبا اور علماء کے سامنے سے اٹھ گئی اور وہ بھی اس کو اپنے عملی درجے سے پست خیال کرنے لگے اور اس سے کام لینا اہلِ صنعت و حرفت کے لئے مخصوص سمجھا گیا۔ اور علوم عالیہ کے لئے صرف فرضی اور گھڑے ہوئے

کلیات کو کافی ہی نہیں سمجھا گیا بلکہ ان کو ہی اہم مانا گیا۔ طبیعیات، الہیات، منطقیات کی یہی حیثیت ہے، عقلیات میں سے وہ فنون جن کو عملی اغراض سے تعلق تھا۔ مثلاً ریاضیات وغیرہ ان میں بھی اس معنی میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی کہ مختلف مشاہدات، تجربات سے ان کے مسلمہ اصول وضوابط میں کمی بیشی یا اصلاح و ترمیم کی جاتی یا مزید اصول کا استخراج کیا جاتا بلکہ برخلاف ازیں اگلوں کو معصوم اور ہمہ دان مانکر محض ان کے کلام کی توجیہ و تاویل پر اکتفا کیا گیا اور اس میں بھی تلخیص اور تشریح و حواشی سے آگے نہ بڑھ سکے۔

ہندوستان کے اسلامی عربی مدارس بالکل جدید دور کی پیداوار بعض خاص مدارس کو چھوڑ کر ہمارے موجودہ عربی مدارس کا ڈھانچہ مذکورہ بالا علمی ماحول میں تیار ہوا اور اس فکری نہج پر نصاب تعلیم کو مرتب کیا گیا۔ اساتذہ کی تعلیم و تربیت کے ڈھنگ نے اس کمی پورا کر دیا جو اس نصاب کے تحت تکمیل کرنے کے بعد ممکن تھا کہ رہ جاتی اور ان کو اس طرز تفکر سے نجات دلا سکتی جس کی پرورش یہ نصاب کرتا ہے۔ قبل ازیں کہ میں نصابِ تعلیم کا خاکہ پیش کروں مسلمانوں کے علوم کے دو ممتاز علمی دوروں پر ایک سرسری نظر ڈال لینا مناسب ہے اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ مروجہ درس کو کس قسم کی ذہنی تربیت کرنا چاہیئے۔

مسلمانوں کے علوم کے دو عہد مسلمانوں کی علمی تاریخ پر جس شخص کی نظر ہے وہ جانتا ہے کہ مسلمانوں کی علمی فتوحات کا دور اور ان کی مجتہدانہ قوتِ تصنیف کا عہد ساتویں اور زیادہ سے زیادہ آٹھویں صدی پر ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے تقریباً تمام علمی اکتشافات خواہ فلکیات سے متعلق ہوں یا عنصریات سے طبعیات سے تعلق رکھتے ہوں، خواہ کیمیائے ہندسی ہوں یا حسابی جغرافیائی ہوں یا تخطیط الارض سے متعلق ہیں اسی طرح تمام علوم استخراجیہ کا استخراج اور ان کی تدوین بھی ان صدیوں کے اندر ہی اندر ختم ہو گئیں۔ ان صدیوں کے بعد الا ماشاء اللہ صرف نقل و شرح، تلخیص و تحشیہ باقی رہ گیا۔

اس عہد کی تصانیف میں واضح طور پر فنی اپج اور تحقیقی اور اجتہادی ذہنیت

کا رنگ پہلی نظر میں ہی نمایاں ہو جاتا ہے جزیات سے کلیات کو استنباط کرنے کی کرنے کی کوشش معلوم ہوتی ہے۔ ہر فن پر اس فن کی حیثیت میں غور ہے۔ یہ نہیں کہ ایک فن کے مسائل کی ترجیح میں دوسرے فن کے اصول وضوابط کو دخل دیا جائے دلائل میں فرضی کلیات سے زیادہ استقراء کو اہمیت ہے۔ صحیح استعداد و تحقیق میں اکابر پرستی اور آئمہ کی پیروی حائل نہیں۔

برخلاف ازیں متاخرین اگرچہ تہذیب اور تنقیح کے اعتبار سے متقدمین پر فائق ہیں لیکن ان میں فنی ادبیج کے بجائے جمود اور تقلید ہے۔ اکابر پرستی اور اجتہادی قوت کی کمی کے باعث ان کے یہاں صرف متقدمین کے کلام کی توجیہیں اور تاویلیں ہیں۔ تحقیق و تنقید اول تو ہے نہیں اور اگر ہے تو وہ فنی وجوہ اور استقرائی دلائل پر مبنی نہیں۔ ہر فن غیر فنی مباحث سے بھرا ہوا ہے۔ اعتراضات ہیں جوابات ہیں لیکن ان کا تعلق اس فن سے یا اس فن کی اصولی حیثیت سے بالکل نہیں۔ مثلاً نحو و صرف یا بلاغت کے مسائل جن کی حیثیت خالص لسانی ہے اور اہل زبان سے سماع پر مبنی ہے اس پر محض عقلی اور تجریدی حیثیت میں نظر کرنا متاخرین کی خصوصیت ہے لفظی کج بحثیاں، بے معنی نکتہ آفرینیاں، تخلیص در تخلیص اس طرح کہ کتاب ایک معمہ اور چیستان ہو جائے۔ عملاً متقدمین پرستی اور وہ بھی جانبدارانہ ان تصانیف کا عام اندازہ ہے۔ شرح اور حواشی ایسی توجیہوں اور تاویلوں سے پر ہیں جو مصنفین متون کے ذہن میں بھی کبھی نہ گزرے ہوں اور نہ ان کی طرف کسی پڑھنے والے کا ذہن منتقل ہو سکے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ بجز ابتدائی رسالوں کے متاخرین کی کتابوں سے ممکن ہے کہ سب کچھ آجائے لیکن وہ فن جس میں وہ لکھی گئی ہیں کسی طرح نہیں آسکتا۔ اجتہادی قوت تو پیدا ہونا بڑی چیز ہے۔

موجودہ اسلامی مدارس عربیہ کا نصاب تعلیم ان دونوں عہدوں کی خصوصیات سامنے رکھنے کے بعد میں موجودہ عربی مدارس کے نصاب تعلیم کی ایک سرسری فہرست پیش کرتا ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ اس فہرست کی تمام کتابیں ہر عربی مدرسہ میں زیر درس ہوں بلکہ بعض مدارس

ہیں یہ کل زیر درس ہیں اور کہیں ان میں کا زیادہ حصہ۔ بعض مدارس میں کچھ جزوی ترمیم و تنسیخ کے ساتھ یہی نصاب رائج ہے۔ بہر حال اس فہرست کو پیش کرنے سے مقصود ایک ایسا خاکہ مہیّا کر دینا ہے جس سے ہمارے مدارس کا نصاب کے سلسلے میں ایک عام میلان معلوم ہو جائے گا۔

بالکل ابتدائی صرف و نحو وغیرہ کی تعلیم کے بعد موجودہ مدارس میں مروجہ نصاب یہ ہے۔

صرف و نحو۔ المفصل (جار اللہ محمود بن عمر الزمخشری المتوفیٰ ۵۳۸ھ)

الکافیہ (جمال الدین ابو عمرو عثمان بن عمر المعروف بابن الحاجب المتوفی ۶۴۶ھ) مع الشرح الفوائد الضیائیہ (نور الدین عبد الرحمٰن بن احمد الجامی المتوفی ۸۹۸ھ)

الخلاصہ، المعروف بالالفیہ (جمال الدین ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الطائی المعروف بابن مالک المتوفی ۶۷۲ھ)

الشافیہ (ابن الحاجب)

بلاغت۔ تلخیص المفتاح (۱) (شمس الدین محمد بن عبد الرحمٰن القزوینی الخطیب المتوفی ۷۳۹ھ) مع الشروح المختصر والمطول (سعد الدین مسعود بن عمر التفتازانی متوفی ۷۹۲ھ)

تفسیر۔ تفسیر الجلالین (جلال الدین محمد بن احمد المحلی المتوفی ۸۶۴ھ و جلال الدین عبد الرحمٰن بن ابی بکر السیوطی المتوفی ۹۱۱ھ)

مدارک التنزیل (حافظ الدین ابو البرکات عبد اللہ بن احمد النسفی المتوفی ۷۱۰ھ)

انوار التنزیل (القاضی ناصر الدین ابو سعید عبد اللہ بن عمر البیضاوی المتوفی ۶۸۵ھ)

---

(۱) تلخیص المفتاح "سراج الدین ابو یعقوب یوسف بن محمد السکاکی المتوفی ۶۰۶ھ کی کتاب "مفتاح العلوم" کی قسم ثالث کی تلخیص ہے۔

اصول حدیث۔ نخبۃ الفکر مع الشرح نزہۃ النظر (شہاب الدین احمد بن ابن حجر العسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ)

حدیث۔ الموطا (الامام مالک بن انس الحمیری المتوفی ۱۹۷ھ)

الجامع الصحیح (الحافظ ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری المتوفی ۲۵۶ھ)

الجامع الصحیح (الحافظ ابو الحسین مسلم بن الحجاج القشیری المتوفی ۲۶۱ھ)

سنن ابن ماجہ (ابو عبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی المتوفی ۲۷۳ھ)

سنن ابی داؤد (ابو داؤد سلیمان بن اشعث السجستانی المتوفی ۲۷۵ھ)

الجامع الصحیح (الحافظ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذی المتوفی ۲۷۹ھ)

السنن الصغریٰ (الحافظ ابو عبدالرحمٰن احمد بن شعیب النسائی المتوفی ۳۰۳ھ)

شرح معانی الآثار (ابو جعفر احمد بن محمد الطحاوی المتوفی ۳۲۱ھ)

مشکوٰۃ المصابیح (۱) (ولی الدین ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی)

عقائد النسفی (نجم الدین ابو حفص عمر بن محمد المتوفی ۵۳۷ھ) مع شرح (التفتازانی)

عقائد و کلام۔ المواقف (القاضی عضد الدین عبدالرحمٰن بن احمد الایجی المتوفی ۷۵۶ھ) مع شرح (السید الشریف علی بن محمد الجرجانی المتوفی ۸۱۶ھ) والحاشیۃ الزاہدیہ (میرزا محمد زاہد بن محمد اسلم الہروی المتوفی ۱۱۰۱ھ)

اصول فقہ۔ الحسامی (حسام الدین محمد بن محمد الاخسیکثی المتوفی ۶۴۴ھ)

منار الانوار (ابو البرکات النسفی) مع الشرح نور الانوار (الشیخ احمد بن ابی سعید المعروف بملا جیون الامیٹھوی المتوفی ۱۱۳۰ھ)

---

(۱) مشکوٰۃ المصابیح محی السنہ ابو محمد الحسین بن مسعود البغوی ۵۱۶ھ کی کتاب مصابیح السنہ کی تکمیل و تذییل ہے مشکوٰۃ المصابیح کا سن تصنیف ۷۳۷ھ ہے

(۲) مکتبہ خدیویہ کی فہرست جلد ثانی میں اور ہندوستان کے ایک قدیم مطبوعہ نسخے میں جس کا سن طبع غالباً ۱۲۶۹ھ ہے مصنف کا نام اسحاق بن ابراہیم الشاشی السمرقندی المتوفی ۳۲۸ھ) بیان کیا گیا ہے لیکن اس کی سند مجھے نہیں مل سکی۔

التنقیح مع الشرح التوضیح (
(صدر الشریعۃ الاصغر عبید اللہ بن مسعود المجبوبی المتوفی ۷۴۵ھ)

مع الحاشیہ التلویح (التفتازانی)
کتاب الخمسین فی اصول الحنفیہ المعروف باصول الشاشی (نظام الدین الشاشی)(۱)
مسلم الثبوت (القاضی محب اللہ بن عبد الشکور البہاری المتوفی ۱۱۱۹ھ)
اصول جدل الشریفیہ (السید الشریف) مع الشرح الرشیدیہ (شمس الحق عبد الرشید
وخلاف
بن الشیخ مصطفیٰ الجونفوری المتوفی ۱۰۸۳ھ)
فقہ وفرائض مختصر القدوری (ابوالحسین احمد بن محمد القدوری المتوفی ۴۲۸ھ)
الہدایہ مع الشرح الہدایہ
(ابوالحسن علی بن ابی بکر الفوغانی المرغینانی المتوفی ۵۹۳ھ)
کنز الدقائق (ابو البرکات النسفی)
الوقایہ (تاج الشریعہ محمود بن صدر الشریعہ احمد المجبوبی المتوفی ۶۷۳ھ)
مع الشرح (صدر الشریعۃ الاصغر)
منیۃ المصلی (سدید الدین الکاشغری، من القرن السابع)
تنویر الابصار (شمس الدین محمد بن عبد اللہ الغزی المتوفی ۱۰۰۴ھ)
مع الشرح الدر المختار (علاؤ الدین محمد بن علی الحصکفی المتوفی ۱۰۸۸ھ)
نور الایضاح مع الشرح مراقی الفلاح (ابو الاخلاص حسن بن عماد الوفائی الشرنبلالی المتوفی ۱۰۶۹ھ)

---

(۱) مکتبہ خدیویہ کی فہرست جلد ثانی میں اور ہندوستان کے ایک قدیم مطبوعہ نسخے میں جسکا سن طبع غالباً ۱۲۸۹ھ ہے مصنف کا نام اسحاق بن ابراہیم الشاشی السمرقندی المتوفی ۳۲۵ھ بیان کیا گیا ہے لیکن اسکی سند مجھے نہ مل سکی۔

فرائض السجاوندی المعروف بالسراجی (سراج الدین محمد بن محمد السجاوندی
من القرن السابع)

نثر عربی

مقامات البدیع (بدیع الزماں احمد بن الحسین الہمدانی المتوفی ۳۹۸ھ)
مقامات الحریری (ابو محمد قاسم بن علی الحریری المتوفی ۵۱۶ھ)
نفحۃ الیمن (الشیخ احمد بن محمد الشروانی الیمنی من القرن الثالث عشر)

عربی نظم

المعلقات السبع[1] (حماد ابن سابور الراویہ المتوفی ۱۵۵ھ)
الحماسہ (ابو تمام حبیب بن اوس الطائی المتوفی ۲۳۱ھ)
دیوان المتنبی (ابو الطیب احمد بن حسین الجعفی الکندی المقتول ۳۵۴ھ)

منطق

الشمسیہ (نجم الدین عمر بن علی القزوینی الکاتبی المتوفی ۶۹۳ھ مع الشرح
(قطب الدین بن محمد الرازی المتوفی ۷۶۶ھ) وحاشیہ (السید الشریف)
رسالۃ التصور والتصدیق المعروف بالقطبیہ (قطب الدین الرازی)
مع الشرح (میرزا زاہد)
التہذیب (التفتازانی) مع الشرح الملا جلال (جلال الدین محمد بن
اسعد الدوانی المتوفی ۹۰۸ھ) وحاشیہ (میرزا زاہد) والشرح
الیزدی (نجم الدین عبد اللہ بن حسین الیزدی ۹۸۱ھ او ۱۰۱۵ھ)
سلم العلوم (محب اللہ البہاری) مع الشرح (حمد اللہ بن شکر اللہ
الصدیقی السندیلوی المتوفی ۱۱۶۰ھ) وشرح الملا محمد حسن بن
القاضی غلام مصطفیٰ المتوفی ۱۱۹۹ھ)
ہدایۃ الحکمۃ (اثیر الدین مفضل بن عمر الابہری المتوفی فی حدود ۶۶۳ھ)
مع الشرح القاضی کمال الدین حسین بن معین الدین المیبذی المتوفی
۹۱۰ھ او فی حدود ۹۰۴ھ) وشرح (صدر الدین محمد بن ابراہیم الشیرازی
المتوفی ۱۰۵۰ھ) وشرح الخیرابادی (شمس العلماء عبد الحق بن فضل حق
الخیر آبادی المتوفی ۱۳۱۶ھ)

---

(۱) مشہور جاہلی شعراء امراء القیس طرفہ بن العبد زہیر بن ابی سلمیٰ لبید بن ربیعہ عنترہ بن شداد حارث بن حلزہ الیشکری اور عمرو بن کلثوم کے سات قصیدوں پر یہ مجموعہ مشتمل ہے۔

الحکمۃ البالغہ مع شرح الشمس البازغہ (ملا محمود بن محمد الفاروقی المتوفی ۱۰۶۲ھ)

الہدیۃ السعیدیہ (فضل الحق بن فضل امام الخیرآبادی المتوفی ۱۲۷۸ھ)

ہیئت الملخص فی الہیئۃ (محمود بن محمد الجغمینی الخوارزمی من القرن السابع) مع شرح قاضی زادہ (صلاح الدین موسیٰ بن محمود الرومی المتوفی ۸۴۰ھ تقریباً)

تشریح الافلاک (بہاء الدین محمد بن الحسین الآملی المتوفی ۱۰۳۰ھ) مع شرح التصریح (امام الدین بن لطف اللہ المہندس بن احمد المعمار اللاہوری الدہلوی المتوفی ۱۱۳۵ھ)

حساب خلاصۃ فی الحساب (بہاؤ الدین محمد الآملی)

ہندسہ تحریر اقلیدس (نصیر الدین محمد بن محمد الطوسی المتوفی ۶۷۲ھ)

مذکورہ بالا نصاب میں جیسا کہ گذر چکا ہے یہ کوشش کی گئی ہے کہ ہندستان کے پرانے قسم کے موجودہ مدارس کی کل درسی کتابوں کا احصار ہو جائے۔ عموماً مدارسِ عربیہ میں اب ’الفیہ‘ اور ’مفصل‘ نہیں پڑھائی جاتیں، نحو کی آخری کتاب ’شرح جامی‘ ہے۔ ’شافیہ‘ بھی عام طور پر زیر درس نہیں ہے۔ تفسیر میں صرف ’جلالین‘ اور کہیں ’مدارک‘ اور ’جلالین‘ درکی تعلیم کافی سمجھی جاتی ہے، بیضاوی کی ’انوار التنزیل‘ کم مدارس میں رائج ہے۔ حدیث میں مشکوٰۃ اور آخر میں ’صحاح ستہ‘ کا دورِ عام ہے جس پر یہ نصاب ختم ہو جاتا ہے۔ عقائد و کلام میں صرف ’شرح عقائد‘ مروج ہے۔ اصولِ فقہ میں ’نور الانوار‘ ’اصول شاشی‘ اور کہیں کہیں ’توضیح‘ اور ’تلویح‘ بھی زیر درس ہیں۔ فقہ میں ’الدر المختار‘ اور ’مراقی الفلاح‘ کا رواج بھی کم ہے۔ عربی نثر میں عموماً مقامات حریری اور ’نفحۃ الیمن‘ کو کافی سمجھا جاتا ہے۔

منطق میں عبد اللہ یزدی کی ’شرح تہذیب‘، ’قطبی‘، زیادہ سے زیادہ ’سلم العلوم‘ اور ’ملا حسن‘ کا رواج ہے۔ حکمت میں ’ہدیہ سعیدیہ‘ اور ’ہدایۃ الحکمۃ‘ یا ’میبذی‘ مروج ہے۔ ہیئت، حساب اور ہندسہ اب قریب قریب نصاب

سے خارج ہو چکے ہیں۔ تاریخ خواہ ذا اقوام و ممالک سے متعلق ہو خواہ علوم و فنون سے نصاب کا لازمی جزو نہیں۔ بعض بعض مدارس میں عرب کی جاہلی تاریخ یا اسلام کی قرونِ اولیٰ کی تاریخ سے متعلق دو ایک مختصر کتابیں ادبی طور پر پڑھا دی جاتی ہیں۔ سرکاری نگرانی میں عامی یا تعلیمی مجالس کے تحت جو نصاب بنایا گیا ہے وہ عربی نثر و نظم اور تاریخ کے مفید اضافے کے ساتھ تقریباً انیس کتابوں پر مشتمل ہے۔ لیکن اس نصاب کے تحت تعلیم حاصل کرنے کا مقصد طلبار کے نزدیک محض مقررہ امتحانات پاس کر لینا ہوتا ہے نہ کہ علم یا ذہنی تربیت حاصل کرنا۔ گویا عملاً نصاب اپنا حقیقی مقصد کھو چکا ہے۔

جہاں تک تعلیم و تدریس کا سوال ہے غالباً یہ نصاب کافی سمجھا جاتا ہے لیکن مطالعہ کے لئے یہ کتابیں اساتذہ اور طلبار دونوں کے نزدیک کافی نہیں۔ اساتذہ اور طلبار دونوں کے مطالعے میں ورنہ کم از کم اساتذہ کے مطالعہ میں عموماً ان کتابوں کے حواشی رہتے ہیں۔ چنانچہ تقریباً ہر کتاب کے لئے اس کے متعدد حواشی کا سامنے رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہ حواشی کل کے کل متاخرین کی جودتِ طبع کا نتیجہ ہیں۔ ان حواشی کی تصنیف کا مقصد بالعموم نہ کتاب کا حل ہوتا ہے اور نہ فن کا احصار بلکہ محض اپنی ذہانت طبع اور دقتِ نظر کا مظاہرہ ہوتا ہے چنانچہ عام حالات میں حواشی کا سمجھنا اصل کتاب کے سمجھنے سے کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

عالباً نحو و اصل فن سے حاشیہ کو بس اتنا تعلق ہوتا ہے کہ وہ اس فن کی ہی ایک کتاب کا حاشیہ ہے۔ مدارس میں عام طور داخلِ نصاب کتاب پوری نہیں پڑھائی جاتی۔ بالکل ابتدائی کتابوں کو چھوڑ کر غالباً کوئی کتاب نہ صرف یہ کہ پوری نہیں ہوتی بلکہ نصف اور بعض کتابیں ربع بھی نہیں ہوتیں۔ بعض بعض کتابوں کی مقدار درس اصل کتاب کا تقریباً دسواں اور بارہواں حصہ ہے۔ بعض کتابوں کی مقدار درس اتنی عام ہو گئی ہے کہ ہندستانی مطابع نے بھی کل کتاب کو طبع کرنے کی زحمت گوارا کرنا چھوڑ دی ہے۔ چنانچہ 'تفسیر بیضاوی' 'مطول' یا 'نفحۃ الیمن' کے کامل نسخوں کے بازار سے حاصل کرنا اب مشکل ہو گیا ہے

بعض درسی کتابیں تو ہندستان میں کبھی کامل طبع ہی نہیں ہوئیں اور ان کے غیر درسی حصے ابھی مخطوطات کی شکل میں ہیں جو کمیاب بلکہ نایاب ہوتے جارہے ہیں۔

بعض درسی فنون کا سرسری خاکہ

مذکورہ بالا نصاب پر ایک عام فیصلہ کن نظر ڈالنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جن فنون پر نصاب بالا مشتمل ہے ان میں سے بعض کی عصری خصوصیات کا ایک سرسری خاکہ پیش کردیا جائے اس طرح نصاب بالا کی صحیح افادیت اور اس کی حقیقی اہمیت کا اجمالی اندازہ ہوجائے گا اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا یہ کتابیں اور بالکل اسی نوعیت کی دوسری کتابیں طلبار کی کسی قسم کی ذہنی تربیت کرسکتی ہیں۔

نحو عربوں کو اپنی زبان کے فطری ملکے کی وجہ سے نحوی قواعد کی ضرورت نہ تھی عجمی اختلاط نے لسانی قواعد کے استخراج اور انکی تدوین کو ناگزیر بنادیا۔ جن قبائل کی زبان عرب میں زیادہ معروف اور متداول تھی اور نسبتہً ایک عمومی زبان کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کی بولیوں سے عربی قواعد کا استخراج کیا گیا۔ قواعد کے استخراج کے سلسلے میں دو مدارس خیال وجود میں آگئے' ایک بصرہ دوسرا کوفہ۔ بصرے کو اہل رائے وقیاس سے زیادہ خصوصیت تھی' اور کوفے کو نقل و روایت سے۔ چنانچہ یہی فرق دونوں مقامات کے نحویوں کے نقطۂ نظر میں پیدا ہوگیا اور اس نے دو مختلف مرکزِ خیال پیدا کردیئے اہلِ بصرہ قیاس و مماثلت کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اہلِ کوفہ سماع کو۔ ان دونوں مدرسوں کے اختلافات کو گہری نظر سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوجاتا ہے کہ مختلف فیہ مسئلے میں عموماً بصری علمار کسی مخصوص جزوی سماع کو اہمیت نہیں دیتے اور حتی الامکان اس کی توجیہ و تاویل کرکے ایک کثیر الوقوع صورت میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جہاں یہ بہ ممکن نہیں ہوتا تو شاذ کہہ کر ترک کردیتے ہیں مگر کوفی علمار اس جزئی مثال کو بھی اصولی اہمیت دینے سے نہیں جھجکتے۔

جب استخراج اور استنباط کا دور ختم ہوگیا تو نحو کی خالص مدرسی حیثیت میں تدوین شروع ہوگئی اس کے بعد تہذیب کا دور آیا' اور آخر میں آٹھویں

نویں صدی سے نحو نام ہوگیا ان استخراجی اصول کی محض عقلی بنیادوں پر توجیہ کرنے کی کوشش کیونکہ عقلی توجیہیں ابتداءً تو محض نکات بعد الوقوع کی حیثیت رکھتی تھیں اور کسی نہ کسی حد تک لگتی ہوئی سی تھیں۔ مگر آگے چل کر انتہائی مضحکہ خیز ہو گئیں اور خود فنی حیثیت اختیار کرنے لگیں۔ اور نحو کی مہارت انہیں مضحکہ خیز موشگافیوں کے جاننے کا نام ہوگیا جن کو نہ فن سے تعلق تھا اور نہ اس کی غرض اور غایت سے۔

بلاغت کلمات کی صوتی خصوصیات، ان کے لغوی معانی اور ان کے استعمال کی نوعیت، مقام کے اعتبار سے ان کی قیمت کا جاننا، جملوں کے اصناف اور انکا باہمی ربط اور مقام کے اعتبار سے ربط کی کو پہچاننا، مختلف مواقع کے اعتبار سے اسالیب کلام اور طرز ادا کی خصوصیت

اور ان اثرات کا علم جنکو وہ پیدا کرتے ہیں، فن بلاغت کا موضوع بحث ہے۔ کلام کو بلیغ بنانے کے لیے ماحول اور متکلم کی نفسی کیفیات، ماحول کی خصوصیت، کلمات کلام اور طرز ادا کے تاثرات ان سب کو جاننا اور ان کے تحت کلام کو ترتیب دینا ناگزیر ہے۔ اہل زبان میں کسی کلام کے بلیغ ہونے کو اور اس حیثیت سے اس کی قدر و قیمت کو سمجھنے کا مادہ عموماً فطری ہوتا ہے اور بلغاء کے کلام اور ان کے اسالیب پر نظر رکھنے سے خود بھی بلیغ کلام پر قدرت ہو جاتی ہے۔ ابتدائی عہد میں فن بلاغت کی تحصیل کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ بلغا کے کلام اور ان پر ادیبوں کے تنقیدی و تعریفی اشارات

جمع کر دیئے جاتے تھے اور اس سلسلے میں مؤلف بھی جو کچھ کہنا ہوتا تھا کہہ دیا کرتا تھا۔ اس دور کے بعد دوسرا دور آیا جس میں کچھ عام اصول جمع کیے گئے لیکن بلاغت کے سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت خود بلغاء کے کلام کو ہی رہی۔ تقریباً چھٹی، ساتویں صدی سے حالت بدلنا شروع ہوئی اور بجائے

بلغاء کے کلام کے ان مستخرجہ اصول نے اہمیت اختیار کرنا شروع کر دی۔ بلغا کے اسالیب اور جملوں نے شواہد اور امثلہ کی حیثیت اختیار کر لی اور یہیں سے اس فن میں بھی جمود پیدا ہونا شروع ہو گیا طویل کلام خواہ وہ نثر ہو یا نظم اسکی اسالیب پر توجہ کرنا گویا متروک ہو گیا آخر میں صرف یہ اصول رہ گئے اور ان میں عقلی موشگافیاں شروع ہو گئیں اس طرح یہ فن بھی اپنی حقیقی غرض و غایت سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ بلاغت محض جامد اصول کی تلخیص اور تشریح اور دور از کار بحثوں کا نام ہو گیا۔

تفسیر

قرآن مجید عرب میں اور عربی زبان میں نازل ہوا صحابہ کے سامنے نازل ہوا۔ اس لئے وہ قرآنی زبان سے اور ان واقعات اور حوادث سے اچھی طرح واقف تھے جن کے سلسلے میں اسکی آیتیں نازل ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں پورا قرآنی ماحول بھی ان کے سامنے تھا۔ ان وجوہ سے قرآنی معنی سمجھنے میں انھیں کوئی دقت نہ ہوتی تھی۔ اس وقت تفسیر کے معنی صرف ان واقعات اور حوادث کا بیان کر دینا تھا جن سے کسی آیت کا تعلق تھا یا اس ماحول کے مطابق کسی لفظ فقرے یا جملے اور عبارت کا مفہوم بتانا یا کسی جزوی مثال کے ذریعہ سے اسے واضح کر دینا یا ناسخ و منسوخ کی تصریح کرنا۔ حلقۂ اسلام کی وسعت کے ساتھ تفسیر میں مشکل الفاظ کی لغوی تشریح بھی داخل ہو گئی تھی۔ چنانچہ قرآن اول و دوم کی تفسیروں کی یہی شان ہے۔ ابتدائی تفاسیر میں ان ہی مختلف روایتوں کو جو صحابہ تک یا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام تک پہنچتی ہیں جمع کر دیا گیا ہے بعض مفسرین نے صحت کا التزام کیا ہے اور بعض نے ہر رطب و یابس کو آئندہ انتخاب کرنے والوں کے لئے جمع کر دیا ہے۔ قرآن میں بہت سے اسرائیلی واقعات اور تلمیحیں ہیں۔ عرب رفع استعجاب کے تحت ان کے متعلق اور ان کے ماسوا ابتدائے خلق وغیرہ کے متعلق ان اہل کتاب کی طرف جو اسلام قبول کر چکے تھے رجوع کرتے تھے۔ یہ بزرگ اپنی معلومات کے بقدر جو محدود اور بڑی حد تک عامیانہ اور غیر مستند ہوتی تھیں ان واقعات اور تلمیحوں کو با ذوسکر مستفرہ واقعات کو بیان کر دیتے تھے۔ اس طرح بہت سی وہ اسرائیلی

روایتیں جن کے ذکر سے بائبل کا عہد قدیم اور عہد جدید اور تالمود بھی خالی ہے قرآنی تفاسیر میں آگئیں۔ اس طرح وہ واقعات بھی جو اگرچہ مروجہ بائبل میں موجود تھے مگر قرآن نے ان کی تصدیق نہیں کی تھی مسلمانوں میں آگئے۔

دوسرے دور کے مصنفین نے اپنے مذاقِ طبع کی بنا پر قدیم تفاسیر یا قدیم تفسیری روایتوں سے جو چیزیں بلا پرکھے ہوئے انتخاب کرلیں تھیں مابعد کے مفسرین ان کو اسی طرح پیٹتے رہے۔ عقلی دور کے شروع ہونے کے بعد مختلف عقلی مفادوں کی حمایت کی بنا پر تفاسیر بھی فلسفیانہ تخیلات کی آماجگاہ بن گئیں چنانچہ آج قرآن مجید کو یونانی اوہام سے جدا کرنا بھی مشکل ہوگیا ہے اسلام میں غیر عربی عنصر کے داخلے کے بعد تفسیریں لسانیاتی نقطہ نظر سے بھی لکھنا شروع ہوگئیں ان تفسیروں میں الفاظ کی نحوی، صرفی اور لغوی حیثیت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

عقائد و کلام

عربی ذہن اپنی بداوت اور سادگی کی بنا پر خدا اور اس کی تنزیہی و تشبیہی صفات کو باریک بینی اور توجیہہ و تاویل کے بغیر اسی طرح تسلیم کرتا تھا جس طرح وہ ثابت تھیں۔ اس سلسلے میں ہر دقیقہ سنجی اور غور و خوض بدعت خیال کیا جاتا تھا۔ یہی حالت کائنات کی ان توجیہوں کے سلسلے میں تھی جو نبی علیہ السلام سے مروی تھیں یا قرآن مجید میں مذکور تھیں۔

جب مختلف قومیں اور مختلف ملتیں اسلام سے وابستہ ہوئے اور دوسری طرف غالباً اول یونانی علوم و فنون اور پھر ایرانی و ہندی خیالات مسلمانوں میں جاگزیں ہونا شروع ہوئے تو اسلامی معتقدات کے متعلق اس سادہ اور بدویانہ نقطۂ نظر میں جو عملی قوموں کا خاصہ ہے تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوگئی۔ یہیں سے علم کلام کی ابتداء ہوئی اور اعتقادیات کے متعلق خالص محدثانہ طرز کی مقبولیت میں فرق آنا شروع ہوگیا۔ سوالات پیدا ہونا شروع ہوگئے جن چیزوں کو بلا تشریح تسلیم کیا جاتا تھا ان کی تشریح کرنا پڑی اس طرح عقائد میں بہت سی تشریحیں نفیاً یا اثباتاً داخل

ہوئیں علوم عقلیہ کی وسعت کے ساتھ عقائد کا باب بھی وسیع ہوتا گیا عقائد کی عقلی توجیہوں کی وجہ سے کلامی مباحث میں فلسفیانہ قسم کی الٰہیات شامل ہو گئی اور کلام ایک تجریدی اسلامی فلسفہ بن گیا اور مختلف مدارس پیدا ہو گئے ان مدارس کے متبعین نے علم کلام میں بھی خالص مدرسیت کی بنیاد ڈالدی۔

لیکن اس کے باوجود ایک جماعت ایسی بھی باقی رہ گئی جو عقائد کے باب میں سلف کی بالکل اس حیثیت میں متبع رہی جو اور ہر قسم کی موشگافیوں اور فلسفیانہ توجیہوں اور تفریعوں کو اثباتاً یا نفیاً تسلیم کرنے سے انکار کرتی رہی مگر اس عقلی شور و شغب میں اس کی اہمیت برابر کم ہوتی رہی۔ آخر چوتھی یا پانچویں صدی میں جب کلام خالص مدرسی حیثیت میں مستحکم ہو گیا اور لوگوں نے کسی نہ کسی مدرسہ خیال سے وابستہ رہنے کو ضروری سمجھ لیا تو اس کی رہی سہی جماعتی اہمیت بھی ختم ہو گئی

اصولِ فقہ

اصولِ فقہ سے ایسے اصول مراد ہیں جن کی بناء پر دلائل شرعیہ قرآن و حدیث اور یا قرآن و حدیث اور اجماع سے مسائل کا استنباط کیا جاتا ہے مختصر لفظوں میں اصولِ فقہ اصولِ اجتہاد کا دوسرا نام ہے چنانچہ جس کسی نے بھی سب سے پہلے کسی مسئلہ کا استنباط کیا ہو گا اسکے لئے اس کے ذہن میں غیر شعوری طور پر ہی کیوں نہ ہو کوئی نہ کوئی اصول ہو گا۔ لیکن جب ضروریات بڑھے اصولِ شرعیہ اپنی مختلف اور متضاد صورتوں میں

سامنے آئے اور ترجیح و تعارض اور مختلف محتملاتِ استنباط کی طرف مجتہدین کی نظریں پڑیں اور مختلف مدارسِ اجتہاد نے اس سلسلہ میں مختلف نقاطِ نظر پیش کئے۔ مجتہدین یا ان کے متبعین نے اپنے اپنے اصول مدون کئے اس طرح ہر دائرے کے اصول دوسرے دائرے کے اصول سے کلیتہً متضاد ہوں۔ ہاں بہت سے اصول میں باہم دیگر خاصا اختلاف ہے ایسی صورت میں اصولِ فقہ ایک ایسا فن ہے جس میں ابتدا سے ہی ایک قسم مدرسیت آگئی۔ مجتہدین کے استخراجی اصول متبعین کے لئے اصولِ موضوعہ بن گئے۔

فقہ صحابہ بلکہ تابعین تک فقہ میں مدرسی رنگ نہیں آیا تھا۔ رواۃ احادیث عام ازیں کہ صاحبِ اجتہاد ہوں یا نہ ہوں۔ ایسے مسائل میں جن کے متعلق ان کے مرویات میں صحیح احادیث موجود ہوتیں، احادیث کی سند پر فتویٰ دیتے تھے۔ جن مسائل کے متعلق ان کی مروی احادیث نہ ہوتیں تو اپنے سے زیادہ احادیث جاننے والوں کی طرف رہنمائی کر دی جاتی اور اگر کسی مسئلے کے متعلق مستند احادیث معلوم نہ ہوتیں تو مجتہدین منصوص مسائل پر قیاس کر کے فتوے دے دیتے۔ تابعین کے نزدیک کسی مخصوص صحابی کی اس معنی میں کوئی اہمیت نہ تھی کہ وہ تمام پیش آمدہ قضیوں میں اس کی طرف رجوع کریں یا اگر کبھی ابتداءً کسی مسئلے میں کسی خاص صحابی کی طرف رجوع کیا ہے تو آئندہ ہر ضرورت میں اس کی طرف رجوع کیا جائے بلکہ اتفاق و سہولت کے تحت ہر اہل کی طرف رجوع کیا جا سکتا تھا اور کیا جاتا تھا۔ تابعین کے آخر عہد سے مختلف مدارس اجتہاد قائم ہونا شروع ہو گئے جن میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔ تیسری، چوتھی صدی میں فقہ پر جب پوری طرح مدرسیت چھا گئی اور مختلف مجتہدین کے اصول و فروع منضبط ہو گئے تو لوگ کسی نہ کسی مجتہد سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے لگے۔ تقریباً چھٹی صدی میں عام طور پر مجتہدین اربع امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد کے مدارسِ اجتہاد تسلیم کر لیے گئے۔

فقہ میں مدرسیت آنے کے بعد فقہی تصانیف میں مدرسیت ناگزیر تھی چنانچہ بالکل ابتدائی تصانیف کو چھوڑ کر عموماً فقہی کتابیں کسی نہ کسی خاص فقہی مدرسے سے متعلق ہو گئیں اور رفتہ رفتہ فقہی کتابوں میں سے اجتہادی نقطۂ نظر بالکل فنا ہو گیا جب تک مختلف فقہی مدارس کی ابتدائی تصانیف نہ ہوں اس وقت تک پڑھنے والوں میں اجتہادی تخیل پرورش نہیں پا سکتا۔

منطق و فلسفہ مسلمانوں میں منطق و فلسفہ کا داخلہ اموی دور سے شروع ہوا اور عباسی دور میں اس کی تکمیل ہوئی۔ شام کے عیسائی صابی اطبا، اور متکلمین ان کے داخلے کا ذریعہ تھے۔ یہ لوگ بالعموم فلسفی نہ تھے

اس لئے ان کے ترجموں میں فلسفیانہ حیثیت سے صحت بہت ہی مستبعد ہے۔ اکثر خود ان کا ماخذ بھی ترجمے تھے یا یونانی فلاسفہ کے خیالات لیکن مخلوط۔ مزید براں بعض کتابیں غلط مصنفین کی طرف منسوب تھیں یہ ذخیرہ تھا جو مسلمانوں کے ہاتھ آیا اور اس پر انہوں نے اپنی عمارتیں کھڑی کر دیں جو ارسطو اور افلاطون کے سر منڈھ دی گئیں۔
بہرحال ابتداءً یہ فلسفیانہ خیالات ایک حقیقی اور معنوی حیثیت رکھتے تھے مگر ساتویں آٹھویں صدی سے ان کی معنوی حیثیت بھی ختم ہونے لگی اور لفظی مباحث نے انکی جگہ لینا شروع کر دی۔ ابتدائی مسلم فلسفیوں کے خیالات کو یونانی فلسفیوں کے خیالات کی تشریح کے طور پر بے چون و چرا تسلیم کیا جانے لگا اور لفظی دقیقہ سنجیوں کا برابر اضافہ ہوتا رہا۔

مذکورہ نصاب پر سرسری نظر حدیث اور ادب کو چھوڑ کر پورے گزشتہ نصاب پر ایک مرتبہ نظر ڈال جائیے۔ ان کتابوں کے بڑے حصے کا عہدِ تصنیف آٹھویں صدی ہجری سے چودھویں صدی تک ہے۔ جو حصہ ساتویں صدی کی تصنیف ہے اس میں اکثر کتابیں عام طور پر نہیں پڑھائی جاتیں جو پڑھائی جاتی ہیں ان میں سے بعض کی اہمیت ذاتی نہیں ہے بلکہ شرحوں کی بنا پر ہے جو بعد کی صدیوں سے متعلق ہیں۔ تین کتابیں چھٹی صدی کی ہیں ان میں سے مفصل، غیر درسی ہوتی جارہی ہے۔ عقائد نسفی، شروح کی وجہ سے اہم ہے۔ پانچویں صدی کی دو کتابیں ہیں۔

اس تقسیم سے حدیث اور ادب کو میں نے قصداً خارج کر دیا ہے متونِ حدیث پر مصنفین کے زمانے کا کوئی اثر نہیں۔ نظم و نثر کی کتابیں اہم ہیں مگر محض ذخیرۂ نثر کے تقریباً ایک ہی عہد سے متعلق ہیں۔ نظم کو بھی اس نصاب میں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں لیکن چونکہ اس نصاب کا مقصد ادبیت کی مہارت پیدا کرنا نہیں لہذا فی الحال یہ خارج از بحث ہے گو یہ حقیقت ہے کہ ادبی مہارت کے بغیر قرآن اور حدیث سے صحیح استفادہ تقریباً نا ممکن ہے حالانکہ اس نصاب کا حقیقی مقصد اس کو قرار دیا جاتا ہے۔

ابنِ خلدون کے قول کے مطابق کسی علم میں مہارت حاصل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس علم کے مبادی، قواعد اور مسائل پر حاوی ہو جانے کی قدرت اور اسکے اصول سے فروغ کو استنباط کرنے کا ملکہ پیدا ہو جائے۔ جب تک یہ قدرت اور یہ ملکہ پیدا نہ ہو اس فن کی مہارت پیدا نہیں ہو سکتی[1]۔ اگر مذکورہ بالا نصاب کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ نہ صرف یہ نصاب علمی مہارت پیدا کرنے سے قاصر ہے بلکہ علم کے صحیح مذاق سے آشنا بنانے کے لئے بھی ناکافی ہے۔

نحو میں 'کافیہ' پڑھایا جاتا ہے اولاً تو کافیہ تمام نحوی مسائل پر حاوی نہیں دوسرے یہ کہ اپنے اختصار کی وجہ سے اتنا مشکل ہے کہ طالب علم کے دماغ پر محض مطلب سمجھنے میں غیر معمولی بار پڑ جاتا ہے۔ اکثر طلبار اس کے نہ سمجھ سکنے کو اپنی کند ذہنی کا نتیجہ خیال کرنے لگتے ہیں جو ان کی ذہنی نشو ونما میں بڑی حد تک حائل ہو جاتا ہے۔ 'کافیہ' کے بعد 'شرح جامی' ہے۔ شروح کی تصنیف کا مقصد ہی چونکہ مسائل کا بیان کرنا نہیں ہوتا لہٰذا 'شرح جامی' اس اعتبار سے تو مفید ہے ہی نہیں کہ وہ نحو کے مسائل پر حاوی ہے نیز اس اعتبار سے بھی مفید نہیں کہ اس سے نحوی مسائل کی تحقیق اور اخذ و استنباط میں مدد ملتی ہے۔ گویا نہ تو نحو کی غرض غایت اور اس کے علم آلی ہونے کے اعتبار سے فائدہ بخش ہے اور نہ فنِ نحو کی اصولی اور ذاتی حیثیت کے اعتبار سے۔ اس میں بجائے اس کے کہ مسائل نحویہ کے دلائل کو اہلِ زبان کی بول چال سے اخذ کرنے کی اہمیت پر زور دیا جائے اور ان کی صحت اور ترجیح کے لئے اہلِ زبان کے سماع کو فیصلہ کن قرار دیا جائے عقلی توجیہیں اور موشگافیاں کی گئی ہیں۔ اس سے طلبار میں فن کا صحیح مذاق پیدا ہونے کے بجائے ایک غلط اور غیر فنی مذاق پیدا ہو جاتا ہے۔

یہی صورت فن بلاغت میں ہے۔ مسائل کے لئے آٹھویں صدی کی صرف

---

[1] مقدمہ ابن خلدون، الفصل السادس من الکتاب الاول فی العلوم واصنافہا والتعلیم وطرقہ الفصل الثانی صفحہ ۳۶

ایک کتاب تلخیص زیرِ درس ہے مع اپنی دو شرحوں کے اور وہ بھی ناتمام۔ فنِ بلاغت کا جو سرسری خاکہ ان میں پیش کیا ہے اس کو اور متاخرین کے عہد کی خصوصیات کو سامنے رکھنے سے غالباً یہ واضح ہو جائے گا کہ یہ کتابیں کسی حیثیت سے بھی مفید نہیں۔

اس نصاب میں جو تفسیریں شامل ہیں وہ نہایت مختصر ہیں اور ترجمے کی حد تک مفید ہیں لیکن اصل قرآن فہمی میں جو تفسیر کا مقصد ہے ان سے زیادہ مدد نہیں ملتی۔ اختصار کے باوجود بھی ان میں اسرائیلیات اور یونانی اوہام مخلوط ہیں۔ صحیح روایات کا التزام نہیں۔ اکثر مقامات پر یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اگر اسرائیلی روایات سے قطع نظر کر لی جائے اور یونانی تصورات علٰحدہ کر دیئے جائیں تو خالص عربی اسلوب عبارت اور لسانی اصول و قواعد کے تحت ان کا کیا مفہوم ہوگا اور قرنِ اول میں کیا مفہوم سمجھا جاتا تھا۔ قرآن میں صحیح تدبر اور غور کرنے کی نہ مشق ہوتی ہے اور نہ ان کے حقیقی حدود متعین ہوتے ہیں بر خلاف ازیں رہے سہے راستے بھی بند ہو جاتے ہیں۔

عقائد و کلام میں جن کتابوں کی تعلیم ضروری ہے ان کے ذریعے سے اسلام کے ان حقیقی اور بنیادی معتقدات و خیالات تک پہنچنا جن پر اسلام موقوف ہے بہت دشوار ہے ان عقائد اور اس کی تشریحات اور عقلی توجیہوں کا ڈھانچ وہ ہے جو اس دور کے مختلف فرقوں کی مذہبی آویزشوں اور مختلف فلسفیانہ خیالات کی ذہنی کشمکشوں کے تحت تیار ہوا ہے لہٰذا اگر وہ کبھی مفید تھا بھی تو آج نہیں رہا ہے اس لیے کہ نہ وہ مذہبی فرقے موجود ہیں اور نہ ان فلسفیانہ خیالات کی کشمکش ہے۔

فقہ و اصول جس حیثیت میں مجروح ہیں اور جو کتابیں موجود نصاب میں شامل ہیں وہ اس اعتبار سے نہایت مایوس کن ہیں کہ ان کی نوعیت محض ایک جامد اور تقلیدی فن کی ہو کر رہ گئی ہے۔ جن سے اجتہاد اور اخذ و استنباط کا ملکہ نہ پیدا ہوتا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ فقہی اصول اور مسائل ایسی مسلمہ حقیقتیں ہیں

جس میں مکرر غور و فکر کی کوئی گنجائش نہیں۔

منطق و فلسفہ وغیرہ عقلی اور تجربی فنون میں جو کتابیں پڑھائی جاتیں ہیں ان کی کیفیت گذشتہ بیان سے اجمالی طور پر معلوم ہوگئی ہوگی۔ ان میں سے متون تو مسائل پر حاوی ہیں جن میں سے بعض اپنے انتہائی اختصار کی وجہ سے بہت دشوار اور طلبہ کے ذہنوں کے لئے بار ہوگئی ہیں۔ لیکن شروح صرف لفظی مباحث اور نکتہ آفرینیوں سے پُر ہیں۔ علاوہ ازیں ان علوم میں اب تک جو اضافے اور جو ترمیمیں اور تنسیخیں ہوچکی ہیں اصولی بھی اور فروعی بھی وہ محتاجِ بیان نہیں ہیئت کلیتہً بدل چکی۔ طبعیات بدل چکی۔ منطق پر تنقیدیں ہوئیں۔ اضافے ہوئے۔ فلسفے کے بہت سے شعبے ہوکر مستقل فنون بن گئے حساب میں بہت سے نئے قاعدوں کا اضافہ ہوا اور ان کے عملوں میں بہت سی نئی سہولتیں پیدا ہوئیں مگر ہمارے مدارس ان تمام جدید تبدیلیوں سے بے خبر ہیں اور ان فنون کو ان کی قدیم جامد شکل میں لئے بیٹھے ہیں گویا یہ عقلی اور تجربی علوم بھی الہامی اور منصوص ہیں جن میں ہر قسم کی ترقی اور حرکت ختم ہوگئی اور تکمیل کے اس نقطے پر پہونچ گئے جس میں صرف لفظی مباحث اور عقلی نکات ہی باقی رہ گئے ہیں۔

طرزِ تعلیم

عربی مدارس کی تمام تر تعلیم کتابی ہے جن فنون کی تعلیم دی جاتی ہے ان فنون کی کتابیں ہی پڑھائی جاتی ہیں۔ داخلِ درس کتابیں ہی اصل فن ہیں۔ بالعموم اساتذہ کے اپنے معلومات بھی فنی ہونے کے بجائے مخصوص کتابوں پر ہی منحصر ہوتے ہیں اور وہ خود بھی نئے معلومات اور فنون کی نئی ارتقائی حرکتوں سے اتنے ہی ناواقف ہوتے ہیں جتنے طلباء۔ انکی فنی بصیرت اور علمی مہارت کے معنیٰ محض زیرِ درس قدیم کتابوں اور انکے حواشی کا علم ہے۔ طالبِ علم زیرِ درس کتاب کو پڑھتا ہے اور استاد اس مقام کے مطلب کی تقریر کرتا ہے۔ اس تقریر میں کتاب کی عبارت پر نظر ڈالی جاتی ہے اور نحوی، صرفی اور بعض اوقات لغوی حیثیت سے اس عبارت پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں ان کو بیان کیا جاتا ہے عموماً یہ اعتراضات

اس کتاب کے حواشی میں مذکور ہوتے ہیں۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ خود اپنی طرف سے اساتذہ اعتراض کریں۔ یہ اعتراضات کبھی حقیقی نوعیت کے ہوتے ہیں اور کبھی بالکل لغو۔ ان اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کی جاتی ہے جن کی حیثیت اعتراضات ہی کی طرح کبھی حقیقی ہوتی ہے اور کبھی کمزور تاویلیں۔ عام طور پر یہ جوابات بھی حواشی سے منقول ہوتے ہیں۔ درمیان میں طلبا، کو بھی یہ حق ہوتا ہے کہ استاد کی تقریر پر یا اصل کتاب پر اعتراضات کریں۔ جن کے جوابات دینا اساتذہ کا پیشہ ورانہ وظیفہ ہے۔ سمجھ دار طلبا، اس حق کو استعمال بھی کرتے ہیں کتاب کی عبارت کے نکات بیان کیے جاتے ہیں اور الفاظ، فقروں اور جملوں تک کی وجہیں بیان ہوتی ہیں گویا مصنف نے ہر ہر لفظ اور ہر ہر تعبیر بہت سوچ سمجھ کر اور عجیب و غریب فوائد کو پیش نظر رکھ کر اختیار کیا ہے حالانکہ ان میں سے کسی ایک کی طرف بھی عام پڑھنے والے کی نظر نہیں پہونچ سکتی۔ اور عموماً یہ سب نکات قطعاً طفلانہ ہوتے ہیں۔ اس اثنا میں اس مقام پر جو فنی اعتراضات وجوابات ہیں ان کو بیان کیا جاتا ہے۔ پوچھا جاتا ہے اور جواب دیا جاتا ہے۔ یہ فنی اعتراضات اور جوابات بھی فن کی قدیم روایات اور متاخرین کی تشریحات کے تحت ہوتے ہیں۔ ورنہ ان کی حقیقی نوعیت بڑی مشتبہ ہوتی ہے۔ دوسرے مصنفین کے بیانات سے جو تعارض واقع ہوتے ہیں ان کی توجیہہ کی جاتی ہے۔ جو عام طور پر ان کی باہمی تطبیق کی کوشش پر منتج ہوتی ہے۔

کتاب کی ایک ایک سطر کے متعلق اس نوعیت کی تقریر بعض اساتذہ ہفتوں بلکہ مہینوں کر سکتے ہیں جو ان کی قابلیت کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ افغانستان اور سرحد کے علاقوں کے اساتذہ جو یک فنی ہونے کے بجائے عام طور پر یک کتابی ہوتے ہیں، وہ تو حقیقتاً مہینوں تقریر کیا ہی کرتے ہیں ورنہ ہفتوں میں تو کوئی کلام ہی نہیں لیکن ہندستان کے اساتذہ اتنے ماہر نہیں، پھر بھی تاہم بعض بعض مقامات کی تقریریں دو دو تین تین دن تک جاری رہتی ہیں۔ اس طرح کہ ہر دن چار چار، پانچ پانچ گھنٹے تقریر کی جاتی ہے۔ اب چونکہ مہارت کم ہوتی جارہی ہے اساتذہ اور طلبا، دنیا بھر کے حواشی نہیں دیکھ سکتے ہیں

اور نہ اتنا مطالعہ ہی کر سکتے ہیں اس لیے تقریر میں بھی اختصار بڑھتا جا رہا ہے۔

اساتذہ کا روشن خیال طبقہ اس طرز سے پہلے سے ہی متنفر ہے اور یہ تنفر برابر بڑھ رہا ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ محض کتاب کو اس کی عبارت کے پڑھانے تک محدود کیا جائے۔ گو یہ طریقہ عام طلباء کے لیے باعث دلکشی نہیں اور پرانے قسم کے اساتذہ کے نزدیک بھی علمی مہارت کے خلاف ہے۔ یہ طریقہ تعلیم اپنی اصل کے اعتبار سے متاخرین کے اس طرز تشریح اور تحشیہ سے ماخوذ ہے جس کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔

یہ طریقہ تعلیم جو اب کچھ بدلتا جا رہا ہے اور خدا کرے جلد سے جلد بدل جائے کسی حیثیت میں بھی مفید نہیں نہ طلباء میں فنی بصیرت پیدا کرتا ہے اور نہ کتاب فہمی کی استعداد، نہ مسائل ہی یاد رہتے ہیں اور نہ مباحث۔ مسائل مباحث میں مخلوط ہو جاتے ہیں اور مباحث اپنے تنوع اور طوالت کی بناء پر حافظے میں محفوظ نہیں رہتے

اسلامی مدارس کے نصاب کی اِصلاح

اس سے پہلے کہ اسلامی مدارس کے نصاب کی اصلاح کا اور ان میں رائج طرزِ تعلیم میں ترمیم کا اصولی خاکہ پیش کیا جائے یہ مناسب ہوگا کہ خود علم کے مقصد، اسلامی مدارس کی خصوصیات اور عصری مقتضیات و محرکات کے تحت ان کی حیثیت پر ایک معمولی نظر ڈال لی جائے اور اصلاح کے متعلق عام بنیادی تصور کو پیش کر دیا جائے۔ ان چیزوں کے سامنے آجانے کے بعد غالباً اصلاح و ترمیم کی ضرورت اور اس کی صحیح سمت کا تعین خود بخود واضح ہو جائے گا اور ساتھ ساتھ زیر بحث مسئلے کے متعلق عام شکوک کا ازالہ ہو سکے گا۔

علم کا مقصد

اسلام کی اساسی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ہر چیز کے رخ کو خدا کی طرف پھیر کر ہر چیز میں ایک اعلیٰ قسم کی روحانیت سمو دی ہے۔ اس کا عملی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مادی ناکامیاں نہ افراد کو ناکام بنا سکتی ہیں اور نہ جامد اور قنوطی۔ برخلاف ازیں یہ پاکیزہ تخیل ان کے اعمال کو پاکیزہ بنا دیتا ہے

اور ناکامی کو کامیابی کی شکل میں صورت پذیر کر کے مزید سرگرمیوں کے لئے آمادہ کردیتا ہے۔ چونکہ مادی طور پر دنیا کا ہر شخص کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس میں تصادم و تنازع لازم ہے یک کامیاب ہو گا اور دوسرا ناکام۔ اگر ہم چیزوں کو محض مادی نقطۂ نظر سے دیکھنا شروع کردیں تو اس سے علیحدہ ہو کر بھی کہ ناکامی کے بعد جمود اور قنوطیت پیدا ہونا ناگزیر ہے سب سے بڑی خرابی یہ ہو گی کہ ہم جارحانہ خود غرضی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اور اپنے حلقے کے لئے ایک ذلیل قسم کا خطرہ بن جائیں گے۔

اسلام کی یہی ہمہ گیر اور عملی روحانیت علم کی غرض و غایت میں بھی سرایت کئے ہوئے ہے۔ علم کا مقصد اپنے دل میں خدا کا خوف پیدا کرنا اور اس کی معرفت اور رضا کو حاصل کرنا ہے۔ گویا علم کا حقیقی مقصد اور اس کی اصل غرض کسی دنیاوی یا دوسرے لفظوں میں کسی مادی فائدے کا حاصل کرنا نہیں ہے۔ تحصیلِ علم کے بعد یا دورانِ تحصیل میں اگر ہم مادی کشمکشوں میں کامیاب نہیں ہوتے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ علم کی اپنی حقیقی قیمت میں کوئی کمی پیدا ہو گئی۔ ہاں اگر ہم نے علم سے خدا کی ارضی اور سماوی نشانیوں پر تدبر کرنا نہ سیکھا یا ان قوانین و ضوابط پر عمل نہ کیا جو خود ہماری اخلاقی سیاسی اور معاشرتی فلاح کے لئے ہیں اگر ہم اپنے علم سے دوسرے بنی نوع کو فائدہ نہ پہنچا سکے اور اس کو دوسروں کی اصلاح و ترقی میں صرف کرنے سے گریز کیا تو گویا ہم نے علم سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور اس کی حقیقی غرض و غایت سے بہت دور جا پڑے۔

علم کا یہ مقصد ممکن ہے کہ بعض سطحی نظر کے افراد کو عجیب معلوم ہو، مگر ان کے جھٹلانے اور انکار کرنے کے باوجود بھی یہ حقیقت ہے کہ دنیا کی فلاح اور افراد و اقوام کا سکون مادیت کے بجائے روحانیت میں ہے۔ خصوصاً جہاں تک علم کا تعلق ہے اس کی ترقی اور تعلیم و توسیع کے لئے تو خالص مادی نقطۂ نظر زہر سے کم نہیں۔ کیا علم کے متعلق محض مادی نقطۂ نظر رکھنے کا ہی یہ نتیجہ نہیں ہے کہ علم جس کی افادیت اتنی بدیہی ہے کہ اس کی مزید توضیح اور تشریح خود علم کی تحقیر ہے، بجائے اس ہندوستان میں اس میں کمی پیدا کرنے کے ذرائع پر غور ہو رہا ہے بلکہ مختلف طریقوں سے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ کم سے کم لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں اور یہ محض اس لئے

کہ جس علم کو مادی فوائد کا پیش خیمہ سمجھ کر حاصل کیا گیا تھا آج وہ اپنے اس فائدے کو کھو چکا۔ ہم نے علم کو سونے چاندی سے تولا تھا اور علم وفن کی اعلیٰ شہادتوں کو ڈپٹی کلکٹری جیسے عہدوں کا ذریعہ جانا تھا مگر آج خداوندانِ حکومت نہ اس وزن کو قائم رکھ سکے اور نہ اس کی شہادتوں کے ذریعہ ہونے کو۔

بہر حال اور قوموں کے نزدیک علم کا کوئی مقصد بھی ہو لیکن اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک علم کا مقصد خدا تھا یا یوں کہئے کہ انسانِ کامل بننا اور دوسروں کو بنانا۔ تاریخ جانتی ہے کہ جب تک مسلمان جماعتی حیثیت میں علم کے حامل رہے۔ انہوں نے اس مقصد کو برقرار رکھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے اسلامی مدارس میں ابھی تک بھی مادیت نہیں پہنچی ہے۔ ان مدرسوں میں اب بھی مادی فوائد کو سامنے رکھ کر نہ علم پڑھایا جاتا ہے اور نہ پڑھا جاتا ہے۔ اگر یہ مدرسے اپنے اس تخیل کو قائم رکھیں اور آگے کو بڑھیں تو یقین ہے کہ کوئی تعلیمی ادارہ بھی نہ تو علم کی توسیع و اشاعت میں ان کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اور نہ تحقیقات میں اور جہاں تک اصل انسانیت کے کمال کا تعلق ہے تو اس میں غالباً یہ بلا شرکتِ غیرے یکتا ثابت ہوں گے۔

اِسلامی مدارس میں مروّجہ علوم وفنون

ابتدائِ اسلام میں علم کا احاطہ قرآن تک اور پھر حدیث اور اس کے بعد فقہ تک محدود رہا مگر جوں جوں اجنبی علوم آتے گئے یا نئے پیدا ہوتے گئے مسلمانوں نے پوری کشادہ دلی سے ان کی پذیرائی کی۔ اور وہ بھی ان کے تعلیمی مرکزوں کا جزوِ درس بن گئے۔ جو نئے علوم داخل ہوئے اور مسلمانوں نے انھیں قبول کیا ان پہ اگر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں ہر قسم کے علوم تھے عقلی بھی اور نقلی بھی۔ اور عقلی بھی اس قسم کے جن کے اصول و فروع اسلامی اصول و فروع کے صریح خلاف تھے تاہم اسلامی اصول و فروع سے یہ مخالفت اس بات کا سبب نہ بن سکی کہ مسلمان اپنے تعلیمی مرکزوں سے اُن کو خارج کر دیتے۔ پھر ان میں سے جو علوم تجربوں پہ موقوف تھے ان کا تجربہ بھی

کیا گیا اور تجربوں کے لیے جس قسم کے آلات ضروری تھے انھیں حاصل کیا گیا، ایجاد کیا گیا اور ان سے کام لیا گیا۔

نئے نئے اکتشافات اور نئی تحقیقات سے ان میں حذف و اضافہ بھی جاری رہا۔ اس پس منظر کو سامنے رکھ کر یہ کہنا بجا ہے کہ علوم و فنون کی خصوصیت تاریخی طور پر اسلامی مدارس کی امتیازی صفت نہیں یعنی اگر عربی صرف و نحو، ادب و لغت، عقائد، تفسیر و حدیث، یونانی الٰہیات، طبعیات، ہیئت، ہندسہ، ان سب کا مجموعہ یا ان میں سے کوئی ایک یا ایک سے زائد فنون نہ پڑھائے جائیں تو ہماری تعلیم گاہوں پر اسلامی مدارس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ان ہی اسلامی مدارس سے (مختلف عہدوں کے اعتبار سے ان مدارس کی عصری حیثیت کوئی بھی ہو) دینیات، لسانیات تاریخیات، منطقیات ریاضیات، طبعیات، الٰہیات اور دوسرے علوم کے ماہرین نکلے عمومی بھی اور خصوصی بھی۔ لہٰذا اس زمانے میں اگر اسلامی مدارس ان علوم کی جدید عصری ترقیوں اور اضافوں کے ساتھ تعلیم دیں یا دوسرے بالکل جدید اور عصری فنون پڑھائیں تو کسی طرح بھی ان کی روایتی حیثیت سے تضاد اور تخالف نہ ہوگا بلکہ برخلاف ازیں ان کی اپنی تاریخی خصوصیت کا تتبع ہوگا۔

اسلامی مدارس کی تاریخی خصوصیت

یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ جہاں تک علوم و فنون کی خصوصیت کا سوال ہے اسلامی مدارس اور دوسری تعلیم گاہوں میں کوئی حقیقی فرق نہیں۔ ان میں فرق و امتیاز بالکل دوسری نوعیت کا ہے۔ جو نسبتہً زیادہ گہرا اور زیادہ بنیادی ہے۔ اسلامی مدارس میں اور دوسری تعلیم گاہوں میں وہ امتیاز مذہبیت اور لامذہبیت ہے۔

اسلامی مدارس کی بنیاد مذہب پر ہے۔ مسلمانوں کے جتنے بھی علوم و فنون ہیں ان میں کسی نہ کسی طرح اسلامیت شامل ہے۔ یہی حال ان کی تصانیف کا ہے۔ ان کے طرز تعلیم میں بھی یہ عنصر موجود ہے۔ اسلامیت کے شمول سے میرا مقصد

ایک عام اسلامی روح کا شمول ہے جس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ ان کے تمام علوم وفنون میں اسلام کی حیثیت مخدومانہ اور دوسری چیزوں کی خادمانہ رہتی ہے۔

مرحوم حضرت علامہ سید سلیمان صاحب ندوی نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں بہت لطیف پیرائے میں فرمایا تھا کہ مسلمانوں نے ہر قسم کے علوم سیکھے مگر اس طرح کہ پہلے ان کو مسلمان کر لیا۔ علمی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کے اس طریقۂ تفکر اور طرزِ عمل نے ان کو علمی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں رکھا۔ بلکہ وہ اپنے دورِ ترقی میں تمام معاصر قوموں سے اس مسابقت میں آگے نکل گئے۔ اس خیال کو اگر ابھری محرکات کے تحت اور نئے تعلیم یافتہ طبقے کی زبان میں ادا کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے علوم وفنون میں ان کی تعلیم میں اور بنا بریں ان کے مدارس میں ایک نصب العین تھا۔ اور ان سب چیزوں کا رخ تھا ان کے اپنے قومی اور ملی تصوراتِ حیات کی طرف اس طرح افراد کی آزادی جماعت کے مقصد اور نصب العین کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئی تھی جس کی وجہ سے اس بین الاقوامی برادری میں ذہنی افتراق و تشتت راستہ نہیں پا سکتا تھا۔

موجودہ اسلامی مدارس میں خوش قسمتی سے آج بھی یہ خصوصیت موجود ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم اپنی جن کوششوں کا رخ اس نصب العین کی طرف پھیرے ہوئے ہیں وہ خود اپنی ذاتی قیمت کھو چکی ہیں۔ ہماری جو آزاد انفرادی ذہنیت جماعتی ذہنیت کے ساتھ ہم آہنگ ہو رہی ہے وہ ذاتی حیثیت میں خود اصلاح کی محتاج ہے۔ بہر حال اسلامی مدارس کی یہ امتیازی خصوصیت ہے جو ان کے تمام عہدوں میں یکساں مشترک ہے۔

دوسرے مدارس کی تشکیل چونکہ اسلام کی بین الاقوامی برادری کے نصب العین اور بین الملی تصورات اور اس کے جماعتی مزاج کے تحت نہیں ہوئی ہے بلکہ دوسرے نصب العینوں اور دوسرے تصورات اور دوسرے جماعتی مزاجوں کے تحت ہوئی ہے ان میں تعلیم کے مقصد دوسرے ہیں۔ بنا بریں ان کے طلبا اور اساتذہ

دونوں اپنی جماعتی حیثیت میں، ہماری اسلامی درسگاہوں کے اساتذہ اور طلباء سے نہ صرف علوم و فنون کے اعتبار سے بلکہ اس سے زیادہ گہری اور زیادہ بنیادی حیثیت کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ اور یہی فرق ان دونوں قسم کی درسگاہوں میں ہے جب تک یہ فرق نہ اٹھایا جائے دونوں میں اتحاد ناممکن ہے لیکن اس فرق کو کون اٹھائیگا

یہ اسلامی مدارس کا کام ہے کہ وہ ان کو اپنے آپ میں سمولیں اور اس طرح جدید و قدیم کا فرق مٹا کر دونوں ایک منبر سے دین و دنیا کی خدمت کے لئے آواز اٹھائیں اور علم و عمل میں ایک ہو کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔

مدارسِ اسلامیہ اور عصری مقتضیات و محرکات

موجودہ اسلامی مدارس میں زمانے کی ضرورتوں اور اہل زمانہ کی ذہنیتوں سے بالارادہ یا بلا ارادہ تغافل برتا گیا ہے۔ اور جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے علوم و فنون کی موجودہ ترقیوں اور وسعتوں سے تو گویا قصداً بے خبر رہنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسلامی مدارس کا یہ طرز عمل جس طرح خالص علمی نقطۂ نظر سے غلط ہے اسی طرح مادی حیثیت میں بھی سخت مضر ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ آج ہندستان کی مشین کے کسی پرزے پر بھی اسلامی مدارس کی تعلیم یافتہ جماعت کا کوئی اقتدار نہیں۔ ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کی نمایندگی خواہ وہ کسی شعبہ سے بھی متعلق ہو مغربی بنیادوں پر استوار درسگاہوں کے تعلیم یافتہ کر رہے ہیں۔ اگر ہماری درسگاہوں کے لیل و نہار یہی رہے تو مستقبل میں بھی کوئی امید نہیں کہ ان کو اس مشین میں کوئی دخل ہوگا۔ بلکہ جس طرح غلام ملک کے نظام کی فکری اور عملی باگ ڈور اجنبی اقتدار کی سرپرستی میں فرنگیت اساس کالجوں کے تعلیمیافتہ طبقے کے ہاتھ میں رہی اس طرح آزاد ملک کے نظام کی قیادت بھی بلا شرکت غیرے اس طبقے کے ہاتھوں میں رہے گی۔

اس کے علاوہ سب سے اہم وجہ جو زمانے کی ضرورتوں اہل زمانہ کی ذہنیتوں اور علوم و فنون کی ترقیوں اور وسعتوں سے باخبر رہنے پر اور ان میں حصہ لینے پر ہمیں مجبور کرتی ہے وہ ہمارے مذہب یا اسلام کا مطالبہ ہے۔ اور یہی چیز ہے جو

ہمارے تمام اسلامی مدارس کا محور اور ان میں تعلیم و تعلم کی اساس ہے۔

یہ کہنا کہ مذہب خدا اور بندے کا ایک ذاتی روحانی تعلق ہے ممکن ہے کہ عیسائیت کے متعلق صحیح ہو مگر اسلام کے متعلق یقیناً غلط ہے۔ یہ غلط خیال بازگشت ہے اس تصور کی جو مغربی علماء نے عیسائیت کے متعلق قائم کیا ہے اور دلیل ہے اس لاعلمی کی جو ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اسلام کے متعلق اب تک بحالہ قائم ہے۔ اور نتیجہ ہے مغرب کی اس کورانہ تقلید و نقالی کا جس میں یہ طبقہ آج بھی پھنسا ہوا ہے۔ حالانکہ جس کو اسلام سے کچھ بھی مس ہو گا اور اس نے اسلام کو معمولی طور پر بھی سمجھنے کی کوشش کی ہو گی وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اسلام جس طرح ایک فکری نظام رکھتا ہے اسی طرح ایک عملی نظام رکھتا ہے اور اس کا یہ فکری اور عملی نظام زندگی اور اس کے تصورات کے ہر ہر شعبہ پر حاوی ہے۔

بہر حال کہنا یہ ہے کہ خالص مذہبی زاویہ نظر کے اعتبار سے اسلام کی تبلیغ فرض ہے خصوصاً علماء پر۔ اس کا ایک نظام ہے اور اس کو قائم کئے بغیر اسلام کے وجود کے کوئی صحیح معنی نہیں۔ اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ ابدی صداقتوں پر مشتمل ہے، اس میں دنیا کی تمام ضرورتوں کی تکمیل ہے، اس کا نظام ہر دور کے پیچیدہ مسائل کا حل ہے اور یہ کہ وہ ایک مکمل اور ہمہ گیر دین ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہم عصرِ حاضر کی ذہنیتوں سے ان کے طرزِ تفکر سے اور ان علوم و فنون سے جن کی واقفیت روزمرہ کے تجربوں اور مشاہدوں نے ثابت کر دی ہے یا ان کے متعلق ایسا یقین کیا جاتا ہے نہ واقف ہوں بلکہ ان میں مہارت نہ رکھتے ہوں اور تاوقتیکہ ہمیں دنیا کے موجودہ مسائل کا علم نہ ہو اور مختلف قسم کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی نظاموں پر گہری نظر نہ ہو جبکہ ملک کی انتظامی اور قانونی مشین میں ہماری حیثیت اثر انداز پرزوں کی نہ ہو اور ساتھ ساتھ اسلام پر بھی ہر ہر زاویہ نظر سے دیکھنے کی استعداد نہ ہو ہم اسلام کی صحیح اور موثر تبلیغ کس طرح کر سکتے ہیں۔ اور اس کے نظام کو بروئے کار لانے میں اپنے فرض کو کس طرح ادا کیا جا سکتا ہے۔

آج دنیا کی زبان بدل چکی ہے۔ اس کے مفروضات اور مسلمات تبدیل ہو گئے

ہیں. اس کے تصورات میں زمین آسمان کا فرق آگیا ہے. طرز تفکر بالکل دوسرا ہو چکا ہے۔ اس کے مسائل دوسرے ہوگئے ہیں اس کی طاقتوں میں نوعی فرق آگیا ہے. اس نے پرانے اسلحہ بالکل بدل ڈالے ہیں. سادے لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ دنیا اور اس کا مزاج کلیتہً بدل گیا. لہٰذا اگر آج ہم کو اس کے سامنے اسلام کی ابدی صداقت کا پیغام پہنچانا ہے تو پہلے سے مختلف زبان اختیار کرنا پڑے گی۔ اور اس کے تفکر کے مطابق نئے طریقوں سے اسلام کو اس کے دماغ میں پہنچانا پڑے گا۔ دنیا کے نئے مسائل کے لئے ہمیں اسلام کو نئے زاویہ نظر سے دیکھنا پڑے گا. اس سے نبرد آزمائی کے لئے نئی طاقتیں حاصل کرنا ہوں گی اور نئی اسلحہ بندی کرنا پڑے گی۔ اس کو متاثر کرنے کے لئے نئے اثرات استعمال کرنا ہوں گے. اس مادی دنیا کے سامنے اسلام کی روحانیت کو اس کی مادی سڑک سے لے جانا پڑے گا۔ اور ان سب کی تیاری بجز ہماری اپنی تعلیم گاہوں، تربیت گاہوں اور تجربہ گاہوں کے کہاں ہوسکتی ہے۔

اسلامی مدارس کی اصلاح کے متعلق ایک بنیادی تصور

اسلام میں دین و دنیا اور روحانیت و مادیت میں افتراق کی کوئی گنجائش نہیں ہے تجربات حیات سے مستفید ہونے کی کوئی ممانعت نہیں بلکہ کائنات میں تدبر و تفکر مسلمان کی خصوصیت ہے. اس سلسلے میں اسلام کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ دنیا میں دین سمویا ہوا ہو اور مادیت میں روحانیت سرایت کئے ہوئے. تجربات حیات سے استفادہ کا مقصد اور کائنات میں تدبر و تفکر کی غرض ربِ حیات اور خالقِ کائنات سے بغاوت و سرکشی کرنا نہ ہو بلکہ اس کی عظمت کا تیقن حاصل کرنا اور اس کی ودیعت کی ہوئی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کر کے منت پذیری کے جذبے کے ساتھ ان سے کام لینا ہو اسلام کے اس تصور کے تحت مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی تعلیم گاہوں کے نقطہ نظر میں اختلاف ہو جاتا ہے. اسی اختلاف کی بنا پر ضروری ہے کہ ہمیں مدارس میں ایک خاص قسم کا ماحول پیدا کرنا چاہئے. اور خاص تربیت کا لحاظ رکھنا چاہئے

اور یہ کہ ہمارے مدارس کو نہ کسی خاص علم وفن سے مختص ہونا چاہئے اور نہ مخصوص اغراض رکھنے والے طبقوں سے، بلکہ تمام علوم وفنون سے اور تمام طبقات سے ان کی مختلف اغراض کا لحاظ رکھتے ہوئے یکساں تعلق ہونا چاہئے۔ اس طرح ان کے طلبا، خواہ کسی علم وفن کی تحصیل کریں اور زندگی کے کسی شعبے کو اپنی جد وجہد کی جولانگاہ بنائیں سب میں ایک قسم کی وحدتِ خیال اور وحدتِ مقصد قائم رہے گی اور باہم تضاد وتخالف پیدا نہ ہو سکے گا۔ ہندستان کے مختلف سرکاری اور غیر سرکاری جدید قسم کے مغربی بنیادوں پر استوار جوامع سے تعلیم یافتہ گان کو دیکھئے ان میں مختلف علوم وفنون کے ماہرین ملیں گے، اس طرح، کہ ایک کو دوسرے کے مضامین سے نہ کوئی دلچسپی ہوگی اور نہ کوئی ادنیٰ تعلق، اور ساتھ ساتھ نہ طرزِ معیشت میں یکسانی ہوگی۔ نہ معاشرتی درجات میں، اور نہ ان کی عملی سمتوں میں اتحاد اور نہ جد وجہد کی جولانگاہوں میں۔ مگر ان سب عظیم اختلافات کے باوجود ان میں ایک وحدتِ خیال اور وحدتِ تفکر موجود ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کام کر سکتے ہیں، اور کرتے ہیں اور یہ اس قسم کی وحدت ہوتی ہے جو ان میں اور ہمارے اسلامی مدارس کے طلبہ میں نہیں ہوتی۔

اس تصوّر کو سامنے رکھ کر ہی ہم کو اپنی درسگاہوں کی اصلاح کی طرف اقدام کرنا چاہئے۔ اور اس طرح تمام علوم وفنون کو اور تمام علمی تجربات کو اور صنعتی تربیتوں کو ایک طرح سے مسلمان بنا لینا چاہئے۔

میں جانتا ہوں کہ ہماری اسلامی درسگاہوں کی پشت پناہی نہ حکومت کرتی ہے اور نہ ہماری قوم کا دولت مند طبقہ، بلکہ ان کا بار محض غریب اور مفلس طبقے کے کمزور کاندھوں پر ہے اور اس لئے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنی درسگاہوں کو جدید قسم کی یونیورسٹیوں کے معیار پر لا سکیں، اور ہر قسم کے علوم وفنون کو ان کی نظری اور عملی حیثیت میں تعلیم دے سکیں، اور اس قسم کے اساتذہ اور اس طرح کے آلات اور دوسرے ضروری سامان مہیا کر سکیں۔ لیکن اپنی اس مکمل بے سروسامانی

کے باوجود ایک چیز کر سکتے ہیں کہ ہم اس قسم کی درسگاہوں کو ایک حقیقی نصب العین بنا کر اپنی موجودہ درسگاہوں کو اپنی نصب العینی درسگاہ کا ایک جزو سمجھ لیں اور اپنی حدود اور وسعت کے مطابق تدریجاً ان کو وسیع کرتے جائیں۔ فی الحال اپنی موجودہ درسگاہوں میں کم از کم کچھ مضامین کی تعلیم شروع کر دیں جن کی حیثیت خالص نظری ہے یا جن کو نظری طور پر بھی پڑھایا جا سکتا ہے۔ ان علوم کی تعلیم کے لئے، ہمیں اپنی ملکی زبان کو ہی اختیار کر لینا چاہئے اور اسی زبان کی کتابوں کو زیر درس کر دینا چاہئے۔ یہ سچ ہے کہ ہمیں فی الحال ایسے اساتذہ نہیں ملیں گے جو ہمارے نصب العین سے یا ہماری تربیت سے ہم آہنگ ہوں لیکن آئندہ جب ہماری جماعت میں یہ علوم آجائیں گے تو اس قسم کی دشواری ختم ہو جائے گی۔

آج علم بہت گراں ہے کیونکہ اعلیٰ تعلیم صرف دولت مند طبقے کے افراد ہی حاصل کر سکتے ہیں اور غریب طالب العلم خواہ اس کو کتنا ہی شوق ہو اور اس کی ذہنی صلاحیتیں کتنی ہی بلند ہوں لیکن اس کو جاہل رہنا پڑے گا۔ اس کے برخلاف آج علم بہت ارزاں بھی ہے۔ اس کو ہر شخص حاصل کر سکتا ہے خواہ اس کی جیب میں علم کی صحیح قیمت دینے کے لئے نہ محنت کے سکے ہوں اور نہ شوق کے خواہ اس کے پاس ذہنی صلاحیت اور فکری استعداد و مناسبت کی معمولی دولت بھی نہ ہو ہاں صرف سونے اور چاندی کے ٹکڑے اس کے یا اس کے سرپرست کے پاس ہوں۔

چونکہ جدید درسگاہوں کی زمامِ اقتدار اس طبقے کے ہاتھ میں ہے جو مغرب کی تہذیب اور تمدن سے متاثر ہے اس کے سامنے وہیں کی گراں تعلیم ہے لہٰذا وہ کبھی بھی علم کو مالی اعتبار سے ارزاں نہیں کر سکے گا جس کا کھلا ہوا نتیجہ یہی ہے کہ علم کی دولت اس کے صحیح مستحقین کو تقسیم نہ ہو سکے گی اور نہ اس میں وسعت پیدا ہو گی لیکن اگر ہماری اسلامی درسگاہیں ان علوم و فنون کو یا ان کے کسی حصے کو اپنے نصاب میں شامل کر لیں تو پھر ان ہی چٹائیوں اور دریوں سے علم اپنے حقیقی مستحقین میں پہونچ سکے گا۔ اور اساتذہ بھی اپنی روائتی للّٰہیت کی بناء پر علم کو تقسیم کرنے میں نہ بخل سے

کام لیں گے اور نہ مالی معاوضے کو اہمیت دیں گے۔ جب ان میں یہی علوم آجائیں گے تو غالباً ان میں محض مغرب کی تقلید اور نقالی نہ ہوگی بلکہ وسیع النظری اور مجتہدانہ استعداد ہوگی۔

اسلامی مدارس کے نصاب کی اصلاح کا اصولی خاکہ

اسلامی مدارس کی موجودہ مالی مشکلات کو سامنے رکھتے ہوئے ان میں تمام متداول علوم وفنون کی تعلیم جس طرح ہونا چاہیے نہیں ہو سکتی۔ مگر تاہم فی الحال بعض ضروری فنون کا خصوصاً جو زیر درس فنون سے مناسبت رکھتے ہیں اضافہ ضروری ہے۔ مثلاً حساب، ہندسہ، مساحت، جغرافیہ، ہیئت، نظری طبعیات، مغربی فلسفہ، نفسیات، سیاسیات، اخلاقیات، اقتصادیات، تاریخ، فلسفۂ تاریخ، اصولِ قانون وغیرہ۔ بقیہ فنون کے لئے نیز ان میں سے بھی بعض فنون کی اعلیٰ تعلیم کے لئے کسی دوسرے وقت کا انتظار کرنا چاہیے اور حالات کے سازگار ہونے کے ساتھ ان کو بڑھاتے رہنا چاہیے کیونکہ ان فنون کی بہت سی کتابیں اردو میں منتقل ہو چکی ہیں لہٰذا مدارس پر ترجمہ کرانے کا بار نہ پڑے گا۔ ان فنون کو قدیم مروجہ فنون کے ساتھ ان کی مناسبتوں کا لحاظ رکھ کے ملا جا سکتا ہے۔ انگریزی کو ثانوی زبان کی حیثیت دیدی جائے۔ مروجہ علوم میں جہاں تک عربی صرف ونحو کا تعلق ہے ابتدائی اور سہل کتابوں پر اکتفا کیا جائے اور ان کو زبان کے ساتھ اس طرح پڑھایا جائے کہ قواعد کی مشق ہو جائے اور لکھنے پڑھنے میں قواعد کی غلطیاں نہ رہیں۔ بقیہ فنون میں متقدمین کی کتابوں کو اور متاخرین کی ایسی تصانیف کو جو مجتہدانہ تحقیقات پر مشتمل ہوں ترجیح دی جائے۔ ابتدائی فنون کو چھوڑ کر اعلیٰ فنون میں فنون کی تاریخوں کو مطالعے کے لئے لازم کر دیا جائے۔ ان تاریخوں سے نہ صرف یہ کہ فن اجمالی طور پر سامنے آجائے گا۔ بلکہ اس کی تدریجی ترقیوں پر اور ان وجوہ واسباب پر بھی نظر ہو جائے گی جن کی وجہ سے ان میں کمی وبیشی ہوتی رہی ہے۔ اور علم کی صحیح قیمت معلوم ہو جائے گی۔ اکثر علوم وفنون کی تاریخیں موجود ہیں بعض قدیم اسلامی فنون ایسے ہیں جن کی تاریخیں میرے علم میں نہیں۔ بہرحال اگر نہ ہوں تو لکھوائی جا سکتی ہیں۔

ان تمام فنون کی تعلیم ظاہر ہے کہ ہر طالب علم نہیں حاصل کر سکتا اور نہ ان سب کو اوسط استعداد کا ایک طالب علم محفوظ رکھ سکتا ہے۔ لہٰذا اسلامی مدارس کی تعلیم کو اگر ان تمام مضامین پر حاوی کیا جائے تو ہمیں اپنے قدیم اور آج کل کے جدید جامعہ کے اصول کی پیروی کرنا ہوگی یعنی مناسب فنون کے جوڑ مقرر کر دیئے جائیں۔ ان جوڑوں کی ترجیح اختیاری ہے۔ ہاں بعض خاص فنون کے اعتبار سے اس کے موقوف علیہ جوڑ ضروری کر دیئے جائیں۔ ہندستان کے موجودہ اسلامی مدارس جو اپنے بعض زیر درس فنون کے اعتبار سے خصوصی شہرت رکھتے ہیں وہ اپنی اس شہرت کو اصلاح و ترمیم کے بعد بھی قائم رکھ سکتے ہیں اس طرح کہ وہ ان فنون پر زیادہ زور دیں اور ان کے لیے خصوصی ماہرین کا انتظام قائم رکھیں اور ان مضامین میں طلبہ کی سخت جانچ کئے بغیر سند نہ دیں۔

اگر اس طریقۂ اصلاح کو اسلامی مدارس کے موجودہ مقصد کے خلاف سمجھا جائے تو بھی کم از کم مروجہ نصاب میں کسی نہ کسی حد تک ترمیم کرنا ناگزیر ہے مثلاً متاخرین کی کتابوں کی اس کثیر تعداد میں کمی کر کے متقدمین کی بعض اہم کتابوں کو داخل کیا جائے حواشی اور شروح نے جو اہمیت ہمارے نصاب میں حاصل کر لی ہے اس کو کم کیا جائے متاخرین کی ایسی تصانیف کو داخل کیا جائے جو مجتہدانہ حیثیت رکھتی ہوں۔ اور ساتھ ساتھ چار پانچ کتابیں جدید فلسفے اور طبعیات و ہیئت کی شامل کی جائیں۔ بعض فنون کی تاریخوں کو مطالعے کے لئے لازم کر دیا جائے۔

مدتِ تعلیم اور مضامین کی تقسیم

مدتِ تعلیم کے تعین، مضامین کی تعلیم کے معیار ان کے صحیح جوڑ اور ان کی صحیح تقسیم کے لئے ان حضرات کی طرف رجوع کرنا پڑے گا جو ان مضامین کے ماہر ہیں اور تعلیم کا تجربہ رکھتے ہیں اس کے متعلق مجھ جیسے بے سواد کی رائے واقع میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی لیکن ان کی ترمیم و تنقیح کے لئے مواد فراہم کرنے کی حد تک ایک معمولی اور مجمل خاکہ غیر مناسب نہ ہوگا۔

مکمل تعلیم کا زمانہ کم از کم پندرہ سال ہونا چاہیے۔

ابتدائی تعلیم کے لئے تین سال جس میں کلام اللہ شریف ابتدائی نوشت و خواند وغیرہ حساب چاروں بسیط قاعدوں تک۔ اردو پڑھانے میں ایسی کتابیں جو اسلامیات سے متعلق

ہوں رکھی جاسکتی ہیں۔

ثانوی تعلیم کے لئے پانچ سال جن میں حساب، مساحت، ہندسہ، جغرافیہ، نقشہ کشی ابتدائی انگریزی زبان کے ساتھ عربی کی ابتدائی صرف ونحو وغیرہ کی تعلیم کو تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ان مضامین میں سے بعض بطور تبادل اختیاری ہوں گے بعض یکے بعد دیگرے۔

جامعی تعلیم کے لئے پانچ سال جن میں سے سال اول میں نحو عربی، بلاغت کے ابتدائی سادے مسائل، فقہ، منطق، انگریزی، تاریخ وغیرہ اس میں بھی مضامین کی کثرت کی صورت میں بشرط ضرورت تبادل اختیاری کیا جاسکتا ہے۔

سال دوم وسوم میں عربی ادب، بلاغت وعروض، فقہ واصول، تاریخ، منطق و مناظرہ، طبیعات، کلام، انگریزی۔ اس دوران میں چار مضامین لازم کر دیئے جائیں گے۔

سال چہارم وپنجم میں عربی ادب، فقہ واصول، اقتصادیات، اصولِ قانون، ہیئت، تاریخ وفلسفہ تاریخ، فلسفہ، کلام، سیاسیات، نفسیات، اخلاقیات، حدیث، انگریزی۔ اس دوران میں تین مضامین لازم ہوں گے۔

بعد الجامعی تکمیل کے لئے دو سال۔ حدیث، فقہ واصول فقہ۔ عربی ادب، اقتصادیات، تاریخ وفلسفۂ تاریخ، فلسفہ مع کلام، سیاسیات، نفسیات، انگریزی، تکمیل کے لئے کوئی ایک مضمون کافی ہوگا۔

ان مضامین میں سے بعض کے ساتھ بعض مناسب جوڑ لازم کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً فقہ واصول فقہ کی تکمیل کے لئے موجودہ عہد میں کم از کم اصولِ قانون ضروری ہے۔ اس کے بعد اقتصادیات کی اہمیت ہے۔ کلام کے ساتھ فلسفہ ناگزیر ہے اور اس کے بعد نفسیات کی ضرورت ہے۔ یا عربی ادبیات کے لئے بلاغت وعروض کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ وعلی ہذا القیاس جن قدیم مضامین میں نئی ترقیاں اور ترمیمیں ہوئی ہیں ان میں ان کی عصری تحقیقات کو حقیقی اہمیت دی جائے۔ تکمیل کی صورت میں مضامین کی تاریخوں کو کافی اہمیت ہے۔ نیز بعض مضامین کی تکمیل موجودہ عہد میں بلا انگریزی جانے ہوئے ممکن ہی نہیں۔ جامعی تعلیم کے دوران میں ترجمہ قرآن کو ختم ہو جانا چاہئے۔ طلبہ کی حیثیت کے مطابق اس کی لسانی اہمیت، عملی افادیت، تاریخی صحت، فلسفیانہ توثیق پر توجہ رکھی جائے۔

طرزِ تعلیم اور تربیت

جہاں تک ابتدائی تعلیم کا یا ان فنون کی تدریس کا سوال ہے جن کی کتاب کے تعلق کے بغیر تکمیل نہیں ہوسکتی ان میں تو تعلیم کو کتاب تک محدود کرنا ہوگا۔ مگر جامعی تعلیم میں کتابوں کو غیر معمولی اہمیت دینا شاید زیادہ مفید نہ ہو۔ چنانچہ جامعی تعلیم میں کم ازکم اس کے آخری سالوں میں تو فن اور مضمون کی تعلیم کی طرف توجہ منعطف رہنا چاہیئے اس طرز سے طلبہ میں اس فن سے دلچسپی پیدا ہوجاتی ہے اور فن پر پوری نظر ہوجاتی ہے۔ مضامین کی تعلیم خالص اجتہادی اور انتقادی ہو مگر اس انتقاد کو محض تخریبی اور سلبی ہی نہ ہونا چاہیئے بلکہ تعمیری اور مثبت ہونا چاہیئے۔ طلبہ میں فنی اجتہاد اور انتقاد کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ حتی الامکان محض لفظی اعتراضات وجوابات سے طلبہ کے ذہن کو محفوظ رکھنا چاہیئے۔ جو موضوع زیرِ درس ہو طلبہ کو پہلے سے اس کے لئے تیار ہونے پر آمادہ کیا جائے اور اس پر مطالعہ کرنے کے لئے کتابیں تجویز کر دینا چاہئیں۔ اس سلسلے میں طلبہ کی اوسط استعداد اور صلاحیت کا لحاظ ضروری ہے۔

فقہ کلام اور قرآن کی تعلیم میں عصری نظریوں کو سامنے رکھا جائے اور آزادانہ مقابلہ کیا جائے۔ فقہ اور کلام میں قرآن وحدیث سے اصول وضوابط کے موافق آزادانہ استخراج و استنباط کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اصول فقہ میں نفس اصول پر نظر ڈالنا ان کی صحت کو جانچنا بھی مفید خدمت ہوگی۔ تکمیلی جماعتوں کے طلبہ کو اپنے اپنے مضامین کی تحقیق پر آمادہ کرنا مفید ہوگا۔

طلبہ کا مقصد کسی فن کی بھی تحصیل ہو لیکن ان کے عادات و اخلاق کی نگرانی بہت ضروری ہے۔ ان کے عام اخلاق و عادات کو اسلامی رہنا چاہیئے ان کو ان درسگاہوں کے مقصد ان کی خصوصیات اور ان کے نصب العین کا پیکر ہونا چاہیئے۔ ان کی توجہ محض مادی فوائد پر مرکوز نہ ہونا چاہیئے۔ اسلامی روح سے نہ یہ کہ صرف ان کو آشنا بنایا جائے بلکہ اسلامی روح کو ان میں جذب کرنے کی کوشش ہونا چاہیئے۔ ان کی عملی قوتوں کو بیدار رکھنا چاہیئے اور ہر شعبۂ حیات میں

مخصوص مقاصد سامنے رکھ کر جدوجہد پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ رواداری، ایثار، خدمتِ خلق اور بنی نوع کی اعانت کے ملکات کی تخلیق میں ان کی مدد کرنی چاہیے۔ یہ کوشش ہونا چاہیے کہ ان کے انفرادی مفاد جماعتی مفاد سے متصادم نہ ہوں۔ ان کا انفرادی نصب العین بین الملی نصب العین سے نہ ٹکرا جائے۔ خلاصہ یہ کہ ان کی تربیت اسلامی ہونا چاہیے اور ان کے لئے ہماری اسلامی درسگاہوں کو اسلامی ماحول مہیا کرنا چاہیے۔

اس تعلیم اور طرزِ تعلیم سے جو طلبہ اس ماحول کے تربیت یافتہ نکلیں گے ان کے متعلق غالباً یہ توقع کرنا بیجا نہ ہوگا کہ ان کے دماغ روشن ہوں گے۔ ان میں صلاحیت فکر و رائے ہوگی۔ اور اجتہادی صلاحیت۔ ان کی زندگی میں ایک ہم آہنگی پیدا ہو جائے گی ــــــــــــــــــــــــــ

ــــــــ اسلامی نصب العین کی طرف ان کا رویہ نہ صرف یہ کہ ہمدردانہ ہوگا بلکہ ایک حد تک والہانہ ہوگا۔ ان میں مختلف صلاحیتیں ہوں گی۔ جن کی بنا پر وہ مختلف شعبہ ہائے حیات میں ہماری نمائندگی کر سکیں گے۔

سید مقبول احمد[1]

اسلام نے شروع ہی سے علم کے حصول پر زور دیا (طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ: حدیث نبویؐ) ۔ قرآنی آیت " وعلم آدم الاسماء کلہا " سے اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علم اور حصول علم ہر انسان کو ورثہ میں ملا ہے ۔ قرآن مجید میں بار بار ذہین لوگوں اور احمقوں میں امتیاز کیا جاتا رہا ہے ۔ عقل کا لفظ اپنی متعدد شکلوں میں قرآن مجید میں ان گنت بار استعمال ہوا ہے ۔ رسول کریمؐ کی بعثت کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ عرب بدوؤں کی غریبی، جہالت، اور پسماندگی دور کریں ۔ اور تعلیم کی اہمیت کا اندازہ ان کے اس قول سے بھی ہوتا ہے کہ " اطلبوا العلم ولو کان بالصین "

ظہور اسلام کے وقت عرب میں لوگ لکھنا زیادہ نہیں جانتے تھے ۔ شاعری سینہ بہ سینہ چلتی تھی ۔ اس لئے شروع میں پڑھنے لکھنے کی طرف بہت زیادہ توجہ دینی پڑی خصوصاً اس وجہ سے کہ قرآن کو لکھنا بھی تھا پڑھنا بھی تھا ۔ رفتہ رفتہ تعلیم پھیلتی گئی ۔ اور اموی عہد میں قرآن ہی سے کئی علوم پھوٹ نکلے اس وقت میں اسلام کے نفوذ کے سبب قرآن ہی کے لئے صرف و نحو کی بنیاد

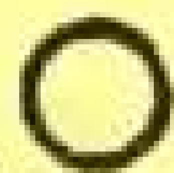
---

[1] پروفیسر ایس مقبول احمد، ڈائرکٹر علی گڈھ سینٹر آف ویسٹ ایشین اسٹڈیز، "عرب جغرافیہ" اور "ہند و عرب تعلقات" کے موضوعات پر متعدد مشہور کتابوں کے مصنف ۔ مسلمانانِ ہند کے رسم، روایات اور اقدار و افکار پر اصلاحی نقطۂ نظر سے لگن کے ساتھ سوچنے والے دس پانچ مغربی تعلیم یافتہ لوگوں میں سے ایک

بھی پڑ گئی ۔ ۸۰۰ ویں صدی میں، غالباً چین سے، کاغذ بھی اِدھر آگیا۔ یہ صدی سیکولر علوم کی ترویج کے اعتبار سے بھی اہم ہے۔ یہی زمانہ ہے جب مسلمان، یونانی، ایرانی، اور ہندستانی علوم سے آشنا ہوئے (گو ایرانی علوم سے کس قدر پہلے سے بھی واقفیت تھی) اس وقت تک بعض اسلامی علوم ارتقا کے منازل طے کر کے اپنی متعین صورتیں بھی اختیار کر چکے تھے: تفسیر، فقہ، صرف و نحو، اور منطق، پہلے عربوں کے یہاں نہیں تھے لیکن ۸۰۰ ویں صدی کے بعد تو جغرافیا، طب، ریاضیات، طبیعیات، اور دوسرے اسی قسم کے علوم بھی عربوں میں در آئے؛ اور اگلی چار صدیوں میں عربوں نے ان علوم کو سیکھنے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ ان میں بنیادی اضافے بھی کئے، اور تعلیم و تحقیق کے متعدد ادارے وجود میں آگئے؛

ابتدائی تعلیم تو مکتبوں اور مدرسوں میں دی جاتی تھی، مگر اعلیٰ تعلیم کے لئے کالج یا یونیورسٹیاں نہیں تھیں۔ جو طلبا، اسلامی علوم کی تکمیل کے خواہشمند ہوتے تھے۔ انھیں اساتذہ کے پاس جانا پڑتا تھا جو اپنے گھروں میں یا مساجد میں اسباق دیتے تھے۔ ہر علم کے خصوصی ماہروں سے کچھ حاصل کرنے کے لئے طلبا کو بعض اوقات خاصے لمبے سفر کرنا پڑتے تھے۔ اطمینانِ خاطر ہو جانے کے بعد اساتذہ اپنے طلبا کو اسناد بھی عطا کرتے تھے۔

عباسی عہد میں تعلیم کی اشاعت کے دوگونہ اثرات مرتب ہوئے؛ ایک طرف سائنس نے ترقی کی، دوسری طرف فلسفہ و طبیعات کے نئے افکار و نظریات نے جو یونانی کتابوں کی راہ سے داخل ہو رہے تھے، مسلمانوں کے مذہبی افکار اور ادراک کے انداز فکر پر ایک مستقل اثر چھوڑا، ایسے ہی ہندو اور بدھ فلسفے نے بھی اپنے اثرات ڈالے۔ اسی لئے، اس عہد میں، مسلمان دانشور متعدد مسلکوں میں بٹے ہوئے ملتے ہیں۔ یہ صورت حال ۱۱ ویں صدی تک قائم رہی۔ پھر سکہ بند مذہبیت غالب آ گئی؛ اور پھر، اگلی کئی صدیوں تک مکمل طور پر چھائی رہی۔



گیارہویں صدی تک سیکولر اور سائنٹفک تعلیم بڑے وسیع پیمانے پر جاری تھی، اور اس کا آزادانہ حصول بہت آسان تھا۔ دینیات کی تعلیم کے سلسلہ میں مدرسوں کا انتظام بھی شروع ہو گیا تھا۔ لیکن اس وقت تک باقاعدہ مدرسے

یا اسکول وجود میں نہیں آئے تھے۔ اس قسم کا پہلا مشہور اور اہم مدرسہ ملک شاہ سلجوقی کے وزیر نظام الملک نے قائم کیا۔ بغداد میں پہلا مدرسہ قائم ہونے کے بعد پوری اسلامی دنیا میں ایک سلسلہ چھڑ گیا۔ ان مدارس کا مقصد دینی اور اخلاقی تعلیم دینا تھا۔ شاید یہ مقصد بھی ہو کہ اسماعیلی تبلیغ کے جلو میں جو الحاد و بے دینی نت نئے رنگ میں پھیلتی جا رہی تھی، اور مصر میں ایک پوری لیثت پناہ سلطنت وجود میں آ چکی تھی، اس سب کا کچھ ازالہ کچھ سدباب ہو سکے۔ اور کیا یہ تاریخ کا ایک واقعہ نہیں ہے کہ حسن بن صباح کے ایک فدائی ہی نے نظام الملک کو قتل کر ڈالا......

نظام الملک کا جو بھی مقصد رہا ہو، لیکن تعلیم کے اس نئے نظام نے اگلی چند صدیوں میں اسلامی معاشرے کے ارتقا پہ کچھ اچھا اثر نہیں چھوڑا۔ اس کے لئے جو نصاب تیار کیا گیا جس میں قطعیت کے ساتھ دین اور اخلاق پہ سارا زور تھا، امام غزالی کا اس پر دیرپا اثر رہا۔ بغداد کے نظامیہ میں غزالی خود بھی درس دیتے تھے۔ ان کے یہاں بنیادی حیثیت اخلاقیات کو حاصل تھی، یہ ان کی تصنیفات سے بھی عیاں ہے: لبرل اور سیکولر اندازِ فکر کے وہ مخالف تھے، یہ بھی طے ہے: یونانی فلسفہ کے تو وہ صاف صاف مخالف ہی تھے، اسماعیلیوں کے بھی خلاف تھے، اس طرح فاطمی خلفا کے بھی۔ چنانچہ ان کے تعلیمی افکار میں اخلاقی تعلیم کا حصول مسلمان کے لئے ایک فریضۂ زندگی قرار پا گیا۔ بقیہ ساری تعلیم (سائنٹفک یا کیسی بھی) کو ثانوی حیثیت دیدی گئی۔ بغداد کے نظامیہ کالج کے افتتاح، اور غزالی کے نئے تصورِ تعلیم نے مسلم معاشرے کی ساری توجہ سیکولر اور سائنٹفک تعلیم سے ہٹا کے مذہبی تعلیم پر مرکوز کردی۔ سائنٹفک تعلیم باقاعدہ اور منظم طریقے پر وہ بھی نہیں جاری تھی، اور نہ حکمراں طبقے کی اسے حمایت حاصل تھی، اس لئے بھی اس کے زوال میں آسانی ہو گئی اس کے برخلاف ان مدرسوں کے نظام کو بادشاہ امرا، اور رؤسا سب کی امداد و اعانت حاصل تھی، جس کے نتیجہ میں کچھ ہی عرصہ میں سلجوقیوں اور ترکوں کے سایۂ عاطفت میں یہ مدرسے پوری اسلامی دنیا میں پھیلنے لگے گئے۔



امام غزالی کا فلاسفہ کی جانب جو رویّہ تھا، اس کے نتیجے میں مسلمان فلاسفہ بے دین قرار دیئے جانے لگے۔ اس طرح یونانی فلسفہ ناپسندیدہ اور ناجائز ٹھہرا، اور رفتہ رفتہ تمام یونانی علوم اور سائنٹفک تعلیم پر زوال آتا گیا۔ جس کے ساتھ آزادانہ جستجو، تلاش اور اوریجنل ریسرچ کے کام بھی تنزل پذیر ہونے لگے۔ بالآخر ایک مرحلہ آگیا جب تعلیم روایتی ہو کر رہ گئی: مدرسوں میں قدیم متن پڑھائے جاتے، اور بجائے اس کے کہ اصل مضمون کی تعلیم ہوتی، متنوں کے نحوی اور لغوی مباحث پر ساری ذہانت صرف ہونے لگی، اور اسلامی علوم میں بھی اب اس کے سوا کوئی قابل قدر اضافہ نہ ہو سکا کہ ان قدیم درسی متون کے حواشی اور شروح کا ایک انبار لگتا چلا گیا۔

مدرسوں کے نصاب میں طبیعات، ریاضی، جغرافیہ، اور ہیئت قسم کے علوم کو کوئی مستقل جگہ نہیں مل سکی، بس دینی اور اخلاقی علوم داخل درس تھے اور انہیں پر سارا زور تھا۔ اگر منطق اور کلام نصاب کا جز تھے تو اس لئے کہ ان کے ذریعہ طالب علم کو ہر قسم کے الحاد و بیدینی کے خلاف اسلام کا دفاع کرنا آجاتا تھا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ، ۱۱ویں صدی میں مسلم تعلیم میں جو تبدیلی آئی، یہ اسی کا اثر تھا کہ ہمارے اپنے عہد تک مدرسوں کا نظام تعلیم محض روایتی ہو کر چلتا رہا۔ یہ تعلیم بڑی SUBJECTIVE قسم کی تھی، اور انتہائی کٹر، جس میں نئے افکار وخیالات کی یا عقائد اسلامی کی سکہ بند توجیہات کے برخلاف کچھ نئے تصورات کی کوئی گنجائش نہ تھی، انہیں الحاد اور بدعت کہہ کر رد کر دیا جاتا تھا۔ تعلیم وتعلّم کے اس عہدِ زوال میں، یعنی ۱۱ویں صدی سے ۱۹ویں صدی تک، کتنے ہی بے گناہ مسلمان اس قسم کے الحاد یا کفر کا شاخسانہ بن کر مرحلۂ دار ورسن سے گذرتے رہے۔

اسلامی معاشرے میں سکہ بند مذہبیت اور آزاد خیالی کی کشمکش کوئی چار صدی چلی، ۸ویں سے ۱۱ویں صدی تک یہ کشمکش تھی عقلیت پسندی

اور سائنٹفک اندازِ نظر — اور مذہبی معتقدات اور روایت پرستی کے درمیان۔ تاریخ عالم میں اس قسم کی کشمکش کے نمونے دوسری جگہوں پر بھی ملتے ہیں: ہندوستانی تاریخ میں مثلاً، موریہ اور گپتا تابناک عہد کے بعد علوم و معاشرہ دونوں پر زوال آتا گیا۔ موریہ اور گپتا عہد میں ہندستانی فلسفہ اور علوم اپنے عروج پر پہنچے ہوئے تھے۔ یہ لبرلزم اور سماجی ترقی کا زمانہ تھا، سیاسی اتحاد اور اقتصادی خوشحالی کا دور تھا۔ مگر ۷ویں یا ۸ویں صدی کے بعد ہندستانی سماج کو زوال کا گھن لگ گیا، جو عہد جدید تک چلتا رہا۔ یہاں، میرے خیال میں، سبب یہ تھا کہ ۷ویں ۸ویں صدیوں میں بدھ مت زوال آمادہ ہو کر برہمنیت کو جگہ دینے لگا تھا۔ بدھ فلسفہ نسبتاً زیادہ دنیوی اور عقلیت پسندانہ اندازِ نظر کا حامل تھا جس نے یقیناً ہندستانیوں میں علم اور سائنٹفک تعلیم کے لئے بے چین خواہش پیدا کر دی ہوگی۔ مذہبی احیاء نے اس کے برخلاف، اپنی دنیا سے دوسری دنیا کی طرف منہ موڑ دیا؛ دوسرے اسباب کے ماسوا غالباً یہ ایک اہم سبب تھا جو ازمنہ وسطیٰ میں ہندستانی فکر کے زوال کے لئے ذمہ دار بنا۔ اور ہندستان سائنس اور تعلیم دونوں میں پسماندہ بنا رہا۔ اگرچہ مذہبی احیاء نے، یوں، کتنے ہی مذہبی فلسفوں اور بھکتی کے افکار کو جنم دیا، لیکن عمومی طور سے ہندستانی معاشرہ سماجی اور ذہنی طور سے، عہد جدید سے قبل، قطعی پسماندہ ہی رہا، تا آنکہ مغربی اثر سے ۱۸ویں ۱۹ویں صدی میں نئی جاگرتی ہوئی۔ اس سے پہلے تو اسلام اور اسلام کا تعلیمی نظام بھی یہاں کے معاشرے میں کوئی قابلِ ذکر تبدیلی نہیں لا سکے! اس کی وجہ یہ تھی کہ تعلیمی نظام جو یہاں رائج کیا گیا وہ جامد ہو کے رہ گیا؛ پھر، یہ بھی ہوا کہ اسلام، اور ہندستان کے دوسرے مذاہب، پہلو بہ پہلو، بلا کسی کشمکش کے پنپتے رہے۔

تاریخ میں اس قسم کی ایک مثال قرونِ وسطیٰ کے یورپ کی بھی ہے، جہاں مذہبی عقیدے اور سائنٹفک انداز نظر میں مقابلہ ہوا۔ لیکن وہاں خوش قسمتی سے کلیسا نے راستہ دے دیا اور تعلیم پادریوں کے حلقۂ اثر سے نکل گئی جس کے نتیجہ میں لبرلزم اور عقلیت پسندی کا دور شروع ہوا، اور سائنٹفک

تعلیم اور تلاش و جستجو نے سائنس کو ایسی ترقی دی جس سے وہ صنعتی انقلاب رونما ہوا جو آج بھی ہمارے سامنے ہے۔

اس قسم کی کشمکش جب عالم اسلام میں ہوئی تو گیارہویں صدی میں عقلیت پسندی ہار گئی اور اس کے بعد سے تعلیم زوال پذیر ہوگئی، اور پھر اسلامی معاشرہ میں اگلی کئی صدیوں تک ترقی کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو سکا۔ یہ بات اس سے بھی ثابت ہے کہ اسلام کے بڑے بڑے دماغ اور دیو زاد عالم، وہ فقہ و دینیات اور کلام میں ہوں یا ریاضی ہیئت جغرافیہ کیمسٹری اور طب میں، تقریباً سب کے سب آٹھویں سے بارہویں صدی تک کے عرصہ میں پیدا ہوئے۔ ابن سینا ابن رشد، البیرونی، عمر خیام اور پھر غزالی وغیرہ سب کے سب اسی عرصے کی پیداوار ہیں۔ اس عہد کے برخلاف اس قد کا کوئی عالم، تیرہویں صدی سے انیسویں صدی تک کے عرصے میں نہیں ملتا، اور بلکہ عہد جدید میں بھی نہیں! کچھ استثنیٰ ضروری ہیں: ابن عربی، ابن تیمیہ، شیخ احمد سرہندی، محمد ابن عبدالوہاب، شیخ سنوسی، مہدی سوڈانی، اپنے اپنے زمانے کے بڑے مفکر تھے، مگر یہ لوگ محض مذہبی مصلح تھے، اور مذہبی مفکر! کچھ قابل تعریف مثالیں شاہ ولی اللہ جیسی بھی ہیں! لیکن ان کے مصلحانہ افکار بھی اسلامی ہند کی روایت پرستی اور تقلید کے خلاف کامیاب نہ ہوسکے!

سائنٹفک تعلیم اور عقلیت پسندی کے زوال کا ایک واضح اثر یہ ہوا کہ بارہویں صدی کے بعد تمام عالم اسلامی میں مسلمانوں کے اندر پسماندگی بڑھنے لگی۔ سائنس کے زوال کے ساتھ مادی ترقی کے لئے وہ ابلتے سوت سوکھ گئے۔ اگر سائنٹفک اور عقلیت پسندانہ تعلیم منظم اور مقبول عام بنائی جاتی، جس طرح کہ گیارھویں صدی کے بعد سے مدرسوں کے نظام کو منظم اور مربوط کیا گیا، تو اسلامی معاشرہ بھی یورپ کی مانند صنعتی اور تکنیکی انقلاب سے اسی عہد میں گزر چکا ہوتا، لیکن مشرقِ اسلامی میں حالات، دوسرا ہی رخ لے چکے تھے!!!



یہ صحیح ہے کہ نظام الملک کے بغداد میں، نظامیہ قائم کرنے سے پہلے بھی کچھ مدرسے موجود تھے: مثلاً نیشاپور کا مدرسہ جہاں غزالی نے تعلیم

پائی، لیکن نظامیہ کے قیام کے بعد سے تو سلسلہ مدارس جنگل کی آگ کی طرح عالم اسلام میں پھیلتا چلا گیا۔ شام، عراق، مصر، عرب، وسطِ ایشیا اور ہندستان میں ہزار ہا مدرسے کھل گئے۔ ان مدرسوں کے نام اور ان کی تاریخیں متعدد مورخوں نے محفوظ کرلی ہیں۔ مثلاً قاضی نعیمی کی کتاب "الدارس فی تاریخ المدارس" میں شام کے مدرسوں کا تفصیل سے ذکر ہے۔ تفسیر، حدیث اور فقہ کے لئے الگ الگ خصوصی مدرسے ہوتے تھے۔ لیکن سب سے بڑی تعداد فقہ کے لئے ہی تھی، اور فقہ میں بھی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی فقہ کے مدرسے ہوتے تھے ۔۔۔ اور اسی طرح اثنا عشری اور اسماعیلی فقہ کے لیے۔

شروع میں کسی ایک خاص فقہی مسلک کو ماننے یا کسی دوسرے کو نہ ماننے کے سلسلہ میں کوئی بہت واضح اصول نہیں تھے۔ مصر کے قاضی اکثر مقدموں میں ایک یا ایک سے زیادہ فقہی مسلک سے مدد لے کر فیصلے کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ صرف ایک مسلک سے وابستگی پر سختی سے عمل ہوتا آیا، اور بالآخر امت چار فقہی مذاہب میں بٹ گئی، جو شروع میں تو محض قرآن و حدیث کی قانونی توجیہہ یا تفہیم کی ایک کوشش تھی، کچھ فقہا کے ہاتھوں، جو بہر حال انسان ہی تھے۔ لیکن پھر وہی انسانی کوشش قانون اور شریعت بن گئی جسے معاشرہ کے مستقل قوانین کا رتبہ مل گیا۔ دین یا عقیدہ کو قوانین اسلام یا شریعت کے ساتھ گڈ مڈ کر دیا گیا، وہ شریعت جو انسانی توجیہات کا نتیجہ تھی؛ پھر ایک مرحلہ پر فقہا کے مابین یہ طے ہوا کہ قرآن اور سنت کا اچھا خاصا مطالعہ ہو چکا ہے، اور اب کسی مزید تفہیم و توجیہہ کی ضرورت نہیں ہے، بالفاظ دگیر اجتہاد یا توجیہہ کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیے گئے۔ یہ روایت پرستی یا تقلید، اسلامی قانون میں ایک اہم عنصر تھی جو اسلامی معاشرہ میں زوال کا باعث بنی ۔۔۔ کہ یہ شرعی قوانین مسلمان کو کسی بھی نئی چیز سے، جو شریعت سے مختلف ہوتی تھی، اثر لینے سے روکتے تھے۔ تاہم اس شرعی جکڑبندی کے باوجود، جو گویا دین کا درجہ اختیار کر گئی، شریعت، تاریخ اسلامی کے ان سارے ادوار میں مسلسل تبدیل ہوتی رہی ہے، اور آج قانون شخصی (پرسنل لاء) کے سوا یا پھر عبادات کے قوانین کے سوا، عملاً ساری

کی ساری شریعت مغربی رنگ میں رنگے ہوئے قوانین اور قانونی تصورات کے لئے جگہ چھوڑ چکی ہے۔

مدارس کا نظام جیسا کہ اوپر کہا گیا ان مختلف فقہی مسلکوں کے مطابق چل رہا تھا۔ ہندستان میں مدارس کا نظام غزنی سے آئے ہوئے ترکوں کے ہاتھوں شروع ہوا۔ ملتان، لاہور اور دہلی میں مدرسے قائم کئے گئے اور عالم اسلام میں دوسری جگہوں پر جو نصاب چل رہا تھا وہ یہاں بھی رائج ہوا۔

کئی صدیوں تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی الّا یہ کہ کوئی مسلمان بادشاہ کچھ سیکولر عناصر کو بڑھاوا دیدیتا یا تعلیم کو کچھ اور وسعت دے کر نصاب میں طبیعی اور ریاضی علوم کو بھی داخل کرادیتا! ایسی ایک کوشش علاؤالدین خلجی نے کی تھی! ایک ایسی ہی اور کوشش اکبر نے بھی کی جب اس نے ریاضی، ہیئت فلسفہ اور بعض دیگر علوم کو نصاب کا جز بنایا۔ مگر اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد گھڑی کی سوئی پیچھے کو لوٹ گئی! پھر مدرسوں کے نظام میں ۱۹ ویں صدی تک کوئی تبدیلی نہیں آئی ..... جب لکھنؤ کے ملا نظام الدین نے نصاب کو سہل بنایا اور ہر مضمون کے لئے متعدد کے بجائے ایک نصابی کتاب (ٹکسٹ بک) بطور متن کے مقرر کردی (پہلے متن بھی کئی کئی تھے حواشی بھی کئی کئی) ملا نظام الدین کے نصاب کو ہندستان کے اکثر مدرسوں نے اپنا لیا اور یہ درس نظامی کے نام سے مشہور ہوگیا۔ آج بھی ہندستان کے ہزاروں مدارس میں یہ سب سے زیادہ رائج نصاب ہے۔ اس کا جھکاؤ سیدھا سادا دینی تعلیم کی طرف ہے، اور اب بھی ایسے مدرسوں کا قیام اور امداد خیر و برکت کا کام سمجھا جاتا ہے! ۱۹ ویں صدی کے اواخر تک ہندستان میں مسلمانوں کے نظام تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں آسکی، اس جمود کو پہلی بار علی گڈھ تحریک کے بانی سرسید نے توڑا انھوں نے جدید اور سائنٹفک تعلیم کی ضرورت کا پسماندہ ملت کے لئے احساس کرایا۔ پھر متعدد مسلمان مفکرین اور مصلحین نے، امیر علی، شبلی وغیرہ نے، مدرسوں کے نظام تعلیم میں اصلاح پر زور دیا۔ لکھنؤ کا ندوۃ العلما بھی مذہبی دیوبند، اور غیر مذہبی (مدرستہ العلوم،

علی گڈھ میں توازن پیدا کرنے کے لئے وجود میں لایا گیا تھا۔ شبلی کا خیال تھا کہ مذہب کو خارج کر کے یکسر جدید تعلیم دینے کی علی گڈھ والی کوشش اور سائنٹفک تعلیم کو چھوڑ کے قطعی مذہبی تعلیم دینے کا دیو بند والا انداز دونوں غلط ہیں۔ اسی نصب العین کو سامنے رکھ کے ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا تھا لیکن یہ اپنے مطمح نظر میں ناکام ہو گیا اور ہندستان کے ان گنت مدارس میں سے ایک مدرسہ ہو کے رہ گیا۔ شبلی اس کے بارے میں بہت پر امید نہیں تھے۔ وہ نظامیہ درس میں بنیادی تبدیلیاں چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اصل مضمون سیکھنے کے بجائے طلبا ان نحوی اور صرفی کج بحثیوں میں پھنسے رہتے ہیں جو شرح اور حواشی لکھنے والوں نے خوب چھیڑ رکھی ہیں۔ اس لئے وہ موجودہ نظام ہی سے قطعی نالاں تھے۔

اب صورت حال یہ ہے کہ اگرچہ مسلمان طلبا کی بھاری اکثریت جدید یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخلہ لیتی ہے . . . . مگر اب بھی ہندستان کے طول و عرض میں چھوٹے بڑے چار ہزار کے قریب یہ مدرسے بھی پھیلے ہوئے ہیں جہاں درس نظامی دیا جاتا ہے۔ طلباء ملت کے مختلف طبقوں سے آتے ہیں، لیکن اکثریت میں غریب یا یتیم ہوتے ہیں۔ جو اسکولوں کالجوں کی ماڈرن تعلیم کا خرچ نہیں جھیل سکتے۔ مگر یہ تعلیم بہت سے سماجی اور اقتصادی مسائل کا سبب بنتی رہی ہے۔ وہ طلبا جوان مدارس سے تعلیم مکمل کر کے نکلتے ہیں۔ نہ کسی سرکاری ملازمت کے لئے اپنے کو پیش کر سکتے ہیں۔ نہ کوئی معمولی کام انھیں مل سکتا ہے۔ مسلمانوں میں حکومت کی طرف سے ان کے لئے کسی مذہبی نوکری کا بھی انتظام نہیں ہے۔ نتیجہ میں وہ مفتی، مولوی پیش امام، موذن، قاضی یا پھر انھیں مدرسوں کے مدرس بن جاتے ہیں۔ بہت سے واعظ کا پیشہ اختیار کر لیتے ہیں (محرم وغیرہ کے مواقع پر) کچھ سیاست میں شامل ہو جاتے ہیں اور فرقہ وارانہ سیاسی پارٹیوں کے ممبر بن کر از منۂ وسطیٰ کے سیاسی نظریوں کا احیاء کرنے لگتے ہیں۔ معاشرہ ان کی کوئی ضرورت پوری نہیں کرتا۔ حالانکہ وہ معاشرہ کی کوئی ضرورت پوری نہیں کرتے ـــــ سوائے مذہبی معنی کے۔ اس لئے میری رائے یہ ہے کہ حکومت ہندستانی عوام، اور خاص کر مسلمانوں کو یہ کوشش کرنی چاہئے مسلم تعلیم کی یہ دوعملی ہندستان میں ختم کر دی

جائے۔ میری سمجھ میں تنہا حل یہی آتا ہے کہ جدید نصابات جن میں تاریخ جغرافیہ سائنس، ریاضیات، اور جدید زبانیں شامل ہوں ان مدرسوں میں جاری کر دیئے جائیں۔ ساتھ ہی فقہ، حدیث، تفسیر، اسلامی تاریخ، اور عربی زبان و ادب کو برقرار رکھا جائے تاکہ طالب علم جدید تعلیم کے ساتھ اسلامی تعلیم بھی حاصل کرتا رہے۔ اور یہ اندازِ تعلیم کچھ مشکل نہیں ہے۔ عیسائی کانونٹ سلسلۂ تعلیم ہمارے سامنے ہے، جہاں عیسائی اساتذہ ہوتے ہیں۔ اور عیسائی ماحول برقرار رکھا جاتا ہے، ساتھ ہی جدید تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اسی طرح اسلامی ماحول ان مدرسوں میں برقرار رکھا جائے جہاں اسلامی تعلیم بھی دی جائے اور جدید تعلیم بھی۔ شروع شروع میں یہ تبدیلی کا انداز خود مسلمانوں کی کوششوں سے شروع ہونا چاہیے، اور مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اس کام میں دلچسپی سے بہت کچھ رضاکارانہ اور بلامعاوضہ کام نکل سکے گا۔ ساتھ ہی ملک کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے مسلم اوقاف کو بھی آگے بڑھ کے اس کام میں ہاتھ بٹانا چاہیے اور ان مدرسوں کی مدد کرنا چاہیے جو اپنے نصابات کو جدید انداز دینا چاہیں۔ رفتہ رفتہ ایسے مدارس کو جو تجدید کر چکے ہیں ریاستی حکومتوں اور متعدد تعلیمی بورڈوں کی طرف سے تسلیم کر دیا (Recognised) چاہئے۔ ان میں سے کچھ پرائمری اسکولوں کا درجہ لے سکتے ہیں کچھ سکنڈری یا ہائر سکنڈری کا، کچھ کالجوں کا، اور ---- دیوبند یا ندوہ کی طرح ---- کچھ یونیورسٹیوں کا بھی۔ اس طرح ان مدرسوں کو تعلیم و تدریس کے جدید اداروں میں تبدیل کیا جا سکے گا۔ اور غریب مسلمان طلبا مفت تعلیم پا سکیں گے ---- اور ہندوستان کے مفید شہری بن سکیں گے!

اخلاق احمد

منگولوں کے حملے سے مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوا۔ ہلاکو خاں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس تخریب کے ساتھ ساتھ ہندستان میں تعمیری کاموں میں تعمیری کوشش کافی زور پکڑتی گئی، وسطِ ایشیا کے فاضل ہندستان میں آنے لگے اور ملک کے گوشے گوشے میں پھیل گئے، اور کاموں کے ساتھ ساتھ درس اور تدریس کا کام بھی بڑی خوبی کے ساتھ انجام پانے لگا۔ اسی طرح درس نظامیہ بغداد کے اثرات ہندستان کی فضا میں بھی پھیل گئے۔

سکندر لودی کے عہد میں تھوڑی تبدیلی نمایاں ہوئی۔ شیخ عبداللہ اور شیخ عزیزاللہ ملتان سے آئے۔ شیخ عبداللہ نے دلّی میں اور شیخ عزیزاللہ نے سنبھل میں سکونت اختیار کی۔ کہا جاتا ہے کہ علم منطق کو ہندستان میں دینی تعلیم کے اندر انھیں حضرات کے وجود سے فروغ ہوا۔ ان کے آنے سے پہلے صرف دو کتابیں رائج تھیں، اگلے دور میں فتح اللہ شیرازی نے نصاب میں کچھ اضافے کیے، اور منطق اور ریاضی پر زور دیا۔ تیسرے اور چوتھے دور میں دو ہستیاں قابلِ غور ہیں جنھوں نے اس سلسلہ میں نمایاں تبدیلیاں کیں۔ ایک شاہ ولی اللہ دہلوی جنھوں نے اہم ترمیمات کیں، اور کتابوں کی ترتیب کو بھی بہت حد تک بدل دیا۔ دوسرے ملّا نظام الدین سہالوی جن کا تیار کردہ نصاب تمام شمالی ہندستان میں رائج ہوگیا۔ ایک عرصے کے بعد اس میں متعدد اصلاحات کی گئیں۔ غالباً سب سے پہلے فرنگی محل کے مولانا قطب الدین نے یہ اصلاحات کیں۔ انھوں نے بعض کتب اور مضامین میں ردوبدل بھی کی۔ ان کے بعد اور تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ یہی درس نظامی معمولی تبدیلی کے ساتھ دارالعلوم دیوبند اور ہندوپاک کے جملہ مدارس عربیہ و دینیہ میں رائج ہے۔ اگر کچھ فرق ہے تو صرف فقہ، عقائد، تفسیر اور حدیث کی کتب میں۔

پانچواں دور اس سلسلہ کا گویا آخری دور ہے جس میں علوم اسلامیہ کی تدریس و تحقیق میں تبدیلی کے لیے کافی کوشش کی گئی۔ اس میں مولانا شبلی نعمانی، مولانا عبدالعزیز نظام آبادی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا شبیر احمد عثمانی اور دیگر علماء

لے ڈاکٹر [illegible] کی نگرانی میں [illegible]

نے نمایاں حصہ لیا۔ خاص طور سے اہل حدیث لوگوں کے مدارس میں انتخاب حدیث اور تفسیر قرآن کے سلسلہ میں خاص اضافے ہوئے ہیں۔ ندوۃ العلماء اور مدرستہ الاصلاح (سرائے میر) میں ترمیم شدہ نصاب رائج ہوگیا۔

درس نظامی سے مختلف نصاب اور درسگاہیں

مدرسہ عالیہ کلکتہ ان میں سب سے نمایاں ہے، اور براہ راست سرکاری ادارہ ہے ــــ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں گورنر جنرل وارن ہسٹنگز نے مسلمانان کلکتہ کی درخواست پر ۱۷۸۰ء میں ذاتی طور پر اس درسگاہ کی بنیاد رکھی۔ ابتدائی دور میں اس کا اس کا ماہانہ خرچ ۶۲۵ روپے تھا جو گورنر جنرل خود برداشت کرتے تھے۔ ۱۸ اپریل ۱۷۸۱ء کو مدرسہ کا معاملہ بورڈ آف ریونیو کے سامنے پیش کیا اور ایک قطعہ زمین خرید کر اس کی عمارت کی بنیاد ڈالی اور اپریل ۱۷۸۲ء میں گورنر جنرل نے انگریزی حکومت سے ادارہ کے لیے پندرہ ہزار روپیہ سالانہ اخراجات کے لیے اور زمین کے واسطے اکیاون ہزار روپیہ یکمشت کی منظوری کے بعد مدرسہ حکومت کے سپرد کر دیا۔

اس مدرسہ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو عربی فارسی کی تعلیم دلاکر ان کو دیوانی اور فوجداری عدالتوں میں، نیز اور دوسرے شعبوں میں جگہ دلائی جائے۔ اس درسگاہ کے سب سے پہلے مدرس مولوی مجدالدین عرف مولوی مدنی تھے لیکن جب فارسی سرکاری زبان نہ رہی اور اس کی جگہ انگریزی آگئی تو مدرسہ میں عربی کے ساتھ ساتھ شعبۂ انگریزی بھی قائم ہوگیا اور ۱۸۵۴ء میں انیگلو پرشین ڈیپارٹمنٹ قائم کیا گیا جو ہائی اسکول کے برابر تھا اور اس کا الحاق کلکتہ یونی ورسٹی سے ہوگیا۔ بعد میں یہ الحاق بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن سے ہوگیا۔ اور شعبہ عربی اپنی جگہ پر قائم رہا۔ جس میں فلسفہ، دینیات، فقہ، ہیئت، ریاضی، منطق، صرف ونحو کی تعلیم ہوتی رہی

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ۱۸۹۴ء میں قائم ہوا تاکہ مجلس ندوۃ العلماء کی

کار روائی کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔ یہ درسگاہ علی گڑھ، دارالعلوم دیوبند اور فرنگی محل کی درمیانی کڑی ثابت ہوئی۔ مجلس ندوۃ العلماء کے پہلے ناظم مولانا سید محمد علی مقرر ہوئے۔ دارالعلوم کے ابتدائی محرک علامہ شبلی نعمانی، نواب علی حسن خاں، مولانا حکیم حبیب الحیٔ اور ان کے رفقاء تھے۔

اس درسگاہ کے نصاب میں جن اصلاحات کا مقصد سامنے تھا، وہ یہ تھیں کہ کتابی مہارت کے بجائے فنی مہارت پیدا کی جائے۔ جدید تحقیقات سے واقفیت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ عربی ادب میں دورِ جاہلیت کے شعراء کے دواوین کو شامل کیا جائے۔ تاریخ اور جغرافیہ نصاب میں شامل ہو۔ انگریزی بحیثیت زبان کے نصاب میں داخل کی جائے، وغیرہ وغیرہ

درجۂ عالیہ اور فضیلت میں فقہ، حدیث، تفسیر، اصول تفسیر، اصول احادیث اور دوسرے متعلقہ علوم شامل ہیں۔ اس کے قدیم فارغ التحصیل لوگوں میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا عبد السلام ندوی، مولانا ریاست علی ندوی، مولانا ابوالحسن ندوی وغیرہ جیسے جید علماء شامل ہیں، مگر اب دوسری ایسی ہستیاں پیدا ہوتی نظر نہیں آتی ہیں۔

مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر)

اس مدرسہ کی بنیاد ایک مقدس ہستی مولانا محمد شفیع مرحوم کے ہاتھوں پڑی۔ کسی حد تک اس کو ندوہ کی شاخ کہا جاسکتا ہے۔ ایک وقت آیا جب علامہ شبلی کو ندوہ سے مایوسی ہوئی تو مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کو اپنی تمام تر توجہات کا مرکز بنا لیا۔ اور ان کی خواہش پر مولانا حمید الدین فراہی نے دارالعلوم حیدرآباد دکن کی نظامت اعلیٰ کو خیرباد کہہ کر مدرسۃ الاصلاح کی تدریس اور نظامت قبول کر لی اور تا زیست اس سے لگاؤ رہا۔ مدرسہ کا نصاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔

یہاں ابتدائی درجہ کا کورس پانچ سالہ ہے اور عربی کا آٹھ سالہ ہے۔ ان آٹھ سالوں میں عربی۔ صرف و نحو اور ادب سے لے کر فقہ، علم الکلام، حدیث، تفسیر اور اصول تفسیر پڑھائی جاتی ہے۔ انگریزی زبان کی تعلیم ایف۔ اے کے معیار تک ہوتی ہے۔

مدرسۃ الاصلاح کے اصلاحی نکات یہ تھے:

قرآن فہمی پر زور دینا۔ قرآن فہمی کے لیے احادیث کے علاوہ ایام جاہلیت کا ادب اور اسلامی دور کے عربی ادیبوں کے کلام کا ضروری مطالعہ وغیرہ وغیرہ۔

جامعہ دار السلام (عمر آباد)

صوبہ مدراس میں آمبور مقام کے پاس عمر آباد ایک چھوٹا سا گاؤں ہے کاکا حاجی محمد عمر نے اس کو آباد کیا، اس میں جامعہ عربیہ دار السلام واقع ہے۔ اس کی بنیاد ۷ دسمبر ۱۹۲۴ء میں پڑی۔

کاکا حاجی محمد عمر کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ تھے۔ چمڑے کا کاروبار کرتے تھے، مگر اہل علم کے بڑے عقیدت مند تھے، اور ان سے تعلقات رکھتے تھے۔ ان میں سے خاص ہستیاں مولانا سید نذیر حسین، سر سید احمد خاں، مولانا بشیر، مولانا سلامت اللہ جیراجپوری، نواب صدیق حسن خاں اور مولانا عبدالجبار غزنوی تھیں۔ انھیں سے متاثر ہو کر دینی اعلیٰ تعلیم کے لیے یہ مدرسہ قائم کیا گیا، دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی علوم کی بھی تعلیم جاری کی گئی۔ پہلے "دار السلام" کے نام سے ایک عربی مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی تھی جو بعد میں "جامعہ عربیہ دار السلام" بن گیا۔

اس مدرسہ کا نصاب قدیم اور جدید دار کی خصوصیات کا حامل ہے۔ پورا نصاب نو سال کا ہے۔ دینی تعلیم کے ساتھ حساب، جغرافیہ اور انگریزی کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ مدراس یونیورسٹی سے مدرسہ کا الحاق ہے۔ طلبا افضل العلماء اور منشی فاضل کے امتحانات میں شریک ہوتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں کامیاب ہوتے ہیں۔

آخر میں، میں تین سوال اٹھانا چاہتا ہوں۔ کیا وجہ ہے کہ دینی تعلیم کے لئے صرف نچلا طبقہ ہی آگے بڑھتا ہے جو فارغ ہونے کے بعد کسی طرح سے سوسائٹی پر اثر انداز نہیں ہوتا ہے اس کا احساس کمتری، اس کی ابھرتی ہوئی صلاحیتوں کو بھی ختم کر دیتا ہے؟ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اکثر جگہ مدارس کے بجائے ان کے مہتمم اپنا بھلا کرتے رہتے ہیں؟ اور کیا یہ غلط ہے کہ ہمارے علمائے کرام کی اولادیں زیادہ تر انگریزی اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی چہار دیواریوں کے اندر معروف تعلیم پائی جاتی ہیں، اور خود دینی درسگاہوں میں اپنے فرائض انجام دیتے ہیں؟

سعید احمد اکبر آبادی[1]

اسلام میں مجرد علم کو جو اہمیت حاصل ہے وہ اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ قرآن میں آدم کے مسجود ملائکہ ہونے کے استحقاق کی وجہ ہی علم کائنات بتایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں "وعلم آدم الاسماء کلھا" میں "کلھا" کی قید خاص طور پر پیش نظر رہنی چاہیئے۔ مذہب تو خیر ایک مسلمان کی زندگی اور اس کا اوڑھنا بچھونا ہی ہے جس پر اس کی دنیا و آخرت کی بھلائی موقوف ہے۔ اس لئے دینی علوم و فنون اور اس کے ممد و معاون علوم و فنون سے دلچسپی لینا اور اس سے شغف رکھنا ایک امر طبعی تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ قرآن میں جگہ جگہ عالم کائنات کو اللہ کی آیات کہا گیا اور اس میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے، پھر یہ بھی فرمایا گیا کہ زمین اور اس کے دریا اور سمندر، جمادات۔ نباتات اور حیوانات اور اسی طرح عالم بالا کی مخلوقات یعنی سورج، چاند۔ ستارے اور سیارے۔ وغیرہ یہ سب انسان کی خدمت اور نفع رسانی کے لئے پیدا کئے گئے اور خدا نے ان سب چیزوں کو انسان کے حیطۂ تصرف و اقتدار میں رکھ دیا ہے۔ (وسخر لکم الشمس والقمر دائبین) اس بنا پر مسلمانوں میں ان علوم و فنون کے حاصل کرنے کا شوق اور ولولہ پیدا ہوا جس کے ذریعہ وہ عالم ارض و سما کی کائنات و مخلوقات سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں علاوہ ازیں اسلام ایک عالمی مذہب تھا اس بنا پر مسلمانوں کو دنیا کی مختلف قوموں اور گروہوں سے ان کی زبان، تاریخ، تمدن، فلسفہ اور ان کی ثقافت سے واقف ہونا ضروری تھا۔ بہرحال یہ وجوہ اور اسباب تھے جن کے باعث مسلمانوں

---

[1] مشہور عالم، برہان کے ایڈیٹر اور علیگڈھ کے شعبہ دینیات میں ریڈر۔ یہ مقالہ سیمینار میں پڑھا گیا۔

نے اپنی تاریخ کے ابتدائی دور میں کبھی کسی علم اور زبان کو اپنے لئے شجرۂ ممنوعہ نہیں سمجھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ قرآنی تعلیمات کے مطابق علوم معاش و معاد کی تحصیل کو اپنے لئے فرض کفایہ قرار دیا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ" ایک اور جگہ ارشاد ہوا "اطلبوا العلم ولو کان بالصین" حضرت زید بن ثابت کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا۔ حضرت سلمان فارسی سے ایرانیوں کا طریق جنگ دریافت فرمایا۔ آپ کے سکریٹریٹ میں جو حضرات کام کرتے تھے ان میں عمرو بن العاص اور عمران بن حصین جیسے متعدد اصحاب تھے جو اپنی زبان کے علاوہ متعدد زبانیں جانتے اور ان میں خط و کتابت کر سکتے تھے۔

البتہ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ اللھم انی اعوذ بک من علم لا ینفع۔ اے خدا میں اس علم سے پناہ مانگتا ہوں جو نافع نہ ہو۔ اس علم سے مراد جفر و رمل اور علم طلسمات و نیرنجات وغیرہ ہیں جن کی بنیاد ظن و تخمین ہے اور جن سے انسانی معاشرہ کے ارتقاء میں کوئی مدد نہیں ملتی، بلکہ انسان اسیر ہجوم اوہام و وساوس ہو کر رہ جاتا ہے علاوہ ازیں اس ارشاد میں آپ نے اس کی طرف اشارہ فرما دیا کہ علم کا مقصد نفع رسانی اور خدمت خلق ہے۔ اس بنا پر اگر کوئی شخص ایسا علم حاصل کرتا ہے جو بذات خود ہے تو نافع، لیکن یہ شخص اسے اس علم کے خزانہ پر سانپ بنا بیٹھا ہے اور کسی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا، یا اس علم سے وہ تخریب انسانی کا کام لے رہا ہے تو بے شبہ اس شخص کا علم بھی "علم لا ینفع" کی تعریف میں داخل ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی مستفاد ہوتی ہے کہ اسلام میں تحصیل علم کا مقصد کس درجہ اعلیٰ و ارفع ہے، اور اس میں کس درجہ ہمہ گیری اور افادیت ہے۔ چنانچہ احادیث میں اس شخص کی مذمت کی گئی ہے جو محض کسب زر اور دنیوی مقصد کے لئے علم حاصل کرتا ہے اور خلق خدا کی خدمت اور ان کی نفع رسانی کا کوئی جذبہ نہیں رکھتا۔

اسلام کی ان تعلیمات اور ان کی اسپرٹ کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے یونان، روم اور ہند و چین کے خزانوں کو کھنگال ڈالا۔ ان کو حیات نو بخشی اور وہ ارسطو کی گاڑی کے قلی ہو کر نہیں رہے۔ ان کی تشریح کی۔ ان پر نقد و تبصرہ کرکے

رطب ویابس کی نشاندہی کی۔ اور ان پر اضافہ کرکے کاروان علم وتحقیق کیلئے پیشقدمی کی نئی نئی راہیں کھولیں۔ مسلمانوں کی تاریخ میں تعلیم قدیم وجدید کا کبھی فرق و امتیاز نہیں ہوا۔ اور انھوں نے کسی علم اور فن کو اپنے لئے اچھوت نہیں سمجھا۔ عربی لٹریچر تو اس کے کارناموں سے پُر ہے۔ انگریزی میں بھی جارج سارٹن کی کتاب LEGACY اور اس کے علاوہ HISTORY OF SCIENCE HERITAGE OF THE ARABS اور OF ISLAM اور HERITAGE OF PERSIA وغیرہ جیسی کتابوں سے معلوم ہوسکتا ہے کہ علوم دینیہ و اسلامیہ کے علاوہ طبعی اور سماجی اور بنیادی علوم وفنون میں سے کوئی علم وفن ایسا نہیں ہے جس کے میدان میں انھوں نے شہسوارانہ تگ وتاز نہ دکھائی ہو اور اس کے ذریعہ انھوں نے انسانی اجتماع و تمدن کے قافلہ کو آگے بڑھنے میں مدد نہ دی ہو۔

ابتدا میں جب مسلمانوں میں بڑے پیمانہ پر اور منظم طریقہ پر مدارس یا جوامع قائم کرنے کا رواج نہیں تھا مسجدوں میں یا خاص خاص گھروں میں چھوٹے قسم کے مکتب ہوتے تھے جنھیں کتاب یا مکاتیب کہتے تھے۔ یہاں قرآن مجید، عربی زبان، اور بعض دوسرے علوم وفنون کی ابتدائی تعلیم ہوتی تھی۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد طالب علم کو جس علم وفن سے زیادہ دلچسپی ہوتی اور وہ اس میں مہارت پیدا کرنا چاہتا تھا تو وہ مختلف بلاد وامصار کا سفر کرتا تھا جہاں مختلف علوم وفنون کے ماہر اور اساتذہ شخصی طور پر مصروف درس ہوتے تھے۔ اس کے بعد جب مدارس قائم ہونے شروع ہوئے جن میں سب سے بڑا بغداد کا مدرسہ نظامیہ تھا، اور اندلس میں قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ کی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں تو ان سب علوم کی تعلیم کا یکجائی انتظام ہوگیا۔ ان مدارس یا یونیورسٹیوں میں نصاب تعلیم جن علوم فنون پر مشتمل ہوتا تھا ان کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ (۱) علوم نقلیہ (۲) علوم عقلیہ (۳) اور علوم آلیہ۔ پہلی قسم میں دینی علوم وفنون شامل تھے۔ دوسری قسم منطق، فلسفہ، ریاضی، علم ہندسہ، علم نجوم اور طب وغیرہ پر مشتمل تھی۔ اب رہی تیسری قسم تو اس سے مراد وہ علوم و

فنون تھے جو علوم نقلیہ اور عقلیہ کے لئے بمنزلہ آلہ یا وسیلہ کے تھے مثلاً صرف ونحو، معانی و بیان و بلاغت، لغت، عروض و قافیہ، تاریخ و جغرافیہ اور شعر و ادب وغیرہ۔

یہ کچھ عرض کیا گیا پرانی داستان کا ایک ورق تھا جو عجب نہیں کہ ہے گا ہے بازخواں ایں قصۂ پارینہ را" کی نصیحت کے مطابق محض "تازہ خواہی داشتن ایں داغہائے سینہ را" کی غرض سے نہیں۔ بلکہ صرف اس مقصد سے سنا دیا گیا ہے کہ جن لوگوں کو ماضی کی روایات سے غیر معمولی عشق ہوتا ہے اور جو ہر منزل میں اسلاف کے نقشِ قدم کی جستجو اور اس کی پیروی کی آرزو کرتے ہیں وہ اپنے حال کے عمل کو ماضی کے آئینہ میں دیکھ کر معلوم کر سکیں کہ خود اپنے نصب العین کے مطابق وہ کہاں تک صراطِ مستقیم پر ہیں۔ بہر حال مسلمانوں کا یہ نظام تعلیم اس وقت تک برقرار رہا جب تک ان میں اس حقیقت کا شعور باقی رہا کہ وہ سارے عالم کے لئے ہیں اور سارا عالم انکے واسطے ہے اجتہاد و اختراع تحقیق و اکتشافات اور حقائق نو کی دریافت کا جذبۂ بیقرار ان میں زندہ و بیدار تھا۔ چنانچہ آٹھویں صدی کے بعد جب ان میں مختلف اسباب و وجوہ کے باعث ذہنی اور علمی انحطاط پیدا ہونا شروع ہوا اور وہ تقلید و جمود فکر کا صید زبوں بن کر رہ گئے تو اب جو علوم و فنون پہلے سے ان کے نصاب درس میں شامل تھے اور جس ہیئت ترکیبی کے ساتھ تھے وہ انھیں پر قانع ہو کر بیٹھ گئے اور چونکہ سیاسی اور سماجی طور پر بھی عالمی برادری سے ان کا رشتہ منقطع ہو گیا تھا اس بنا پر اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یورپ میں جو عظیم الشان علمی اور صنعتی انقلاب پیدا ہو رہا تھا۔ مسلمان ان سے بے خبر رہے اور دنیا جہان کی طرف سے آنکھ بند کئے اپنے اسی پرانے ڈگر پر چلتے رہے، اقبال نے اس صورتِ حال کا جو مرثیہ لکھا ہے اس میں کہتے ہیں۔

آتی ہے دمِ صبح صدا عرشِ بریں سے
کھویا گیا کس طرح ترا جوہرِ ادراک
کس طرح ہوا کند ترا نشترِ تحقیق
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک
اب تک ہے رواں گرچہ لہو تیری رگوں میں
نے گرمیِ افکار، نہ اندیشۂ بیباک
باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

پہلا دور مسلمانوں کی توسیع و ترقی EXPANSION AND
PROGRESS کا دور تھا اور اب سمٹنے سکڑنے اور زوال SHRINKING
AND DECLINE کا عہد شروع ہوا تو ان کی ہر چیز رسمی ہو کر رہ گئی
ہے چنانچہ ان کا نظام تعلیم بھی رسمی (A FORMALITY) اور بے جان
ہو گیا۔ یہ صورتِ حال کسی ایک ملک کے ساتھ مخصوص نہیں تھی، بلکہ پورے عالم
اسلام کو محیط تھی۔ قاہرہ کا جامعۃ الازہر جس نے کبھی ہر علم و فن کے آفتاب و ماہتاب
پیدا کئے تھے اس کا گذشتہ صدی کے آخر میں کیا حال تھا؟ اس کا اندازہ مولانا
شبلی کے سفرنامہ مصر و روم و شام سے ہو سکتا ہے۔ بہر حال کہیں کچھ ہو، ہماری
آج کی مجلس کا مقصد ہندستان کے اسلامی مدارس پر گفتگو کرنا ہے۔ اس لئے اب
اس سلسلے میں چند معروضات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

۱۸۵۷ء میں ہندستان پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد جب مسلمانوں کو یہ
محسوس ہوا کہ اب ان کا دین اور دنیا دونوں خطرہ میں ہیں تو۔ اب ان میں دو تحریکیں
پیدا ہوئیں۔ ایک دیوبند کی جس کو عمر کے اعتبار سے اولیت کا مرتبہ حاصل ہے
اور دوسری علی گڑھ کی۔ علی گڑھ تحریک کا مقصد مسلمانوں کی دنیا کو ہلاکت سے
بچانا اور محفوظ رکھنا تھا۔ اور دیوبند کا مقصد اور نصب العین صرف ان کے دین کی
حفاظت تھا۔ اور چونکہ ہر مسلمان کو خواہ کیسا ہی دنیادار ہو دین سے ربط رکھنا
ناگزیر ہے اس لئے علی گڑھ نے دنیا کا اہتمام کرنے کے باوجود دینیات کی تعلیم کو نظرانداز
نہیں کیا۔ لیکن دیندار مسلمان کے لئے شاید "دنیا" ایسی کوئی ناگزیر ضرورت
نہیں تھی۔ اس لئے دیوبند نے اس طرف توجہ نہیں کی، اور اس نے وہی قدیم نصاب
تعلیم کسی ترمیم و تنسیخ کے بغیر اپنے ہاں رائج کر لیا۔ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا،
درس نظامی جو فارسی اردو اور حساب وغیرہ کی ابتدائی تعلیم کے بعد کم و بیش
آٹھ برس کی مدت پر پھیلا ہوا تھا مذکورۂ بالا تین قسم کے علوم پر مشتمل تھا یعنی
علوم نقلیہ جن کا دوسرا نام علوم دینیہ ہے، اور علوم عقلیہ و علوم آلیہ۔ اس نصاب
کا مقصد ایسے علماء پیدا کرنا تھا جو اپنے درس و افتا اور تبلیغ و ارشاد کے ذریعہ
مسلمانوں کو احکام و مسائل و شرع سے واقف کر سکیں، اسلام پر اگر اعتراضات
ہوں تو اس کا جواب دے سکیں، اور جہالت یا مغربی تعلیم کے باعث جو مسلمانوں

کا ایمان اور اسلام خطرہ میں ہو اس کی حفاظت کا بندوبست کر سکیں جہاں تک اس مقصد کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ دیوبند تحریک کو اہم عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی۔ دیوبند کے چراغ سے ہندستان میں ہزاروں چراغ روشن ہوئے اور اسی نہج اور انداز پر ملک کے طول و عرض میں شہر بشہر مدرسے قائم ہو گئے جنھوں نے مغربی تہذیب کے سیل رواں کے بالمقابل ایک نہایت مضبوط اور آہنی دیوار کا رول ادا کیا۔ ان مدارس نے غیر منقسم ہندستان میں جو کام کیا ہے اس کی حقیقی عظمت کا اندازہ خاکسار راقم الحروف کو الجیریا میں جاکر ہوا جب وہاں اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ فرانسیسی استعمار نے اس ملک کے لوگوں کے مذہب زبان اور کلچر کو اس طرح تحس نحس کر کے رکھ دیا تاکہ یہ لوگ فرانسیسی قومیت کا جزء بن جائیں۔ ہمارے مدارس کی یہ خدمت بے شبہ بڑی اہم اور لائق افتخار ہے۔ لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ یہ ہے کہ ایک خاص قسم کے نصاب اور ایک خاص ماحول و فضا اور طرز رہائش کے باعث یہ مدارس عمومی طور پر ایسے افراد کو پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں جو عہد حاضر کے علمی سماجی اور تہذیبی مسائل و معاملات میں اپنی شان کے مطابق مسلمانوں کی مثبت قیادت کا فرض ادا کرنے کے قابل ہوں، علماء کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ عوامی سطح پر اسلام کی تبلیغ یا وعظ و ارشاد کریں، کتب درسیہ کی تعلیم دیں، انھیں کتابوں کے حواشی اور شروح لکھیں، اور ردالمختار اور قاضی اور فتح القدیر کی اساس پر فتاویٰ لکھیں۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ خود اپنے علوم و فنون پر ناقدانہ اور مجتہدانہ نظر رکھیں، اور جدید علوم و فنون اور جدید تہذیب کے پیدا کردہ مسائل و معاملات جن کا انسانی زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے، ان سب میں مسلمانوں کی علمی اور ذہنی قیادت کریں۔ انگریزوں کے عہد حکومت میں یہ کوتاہی خواہ کچھ ایسی زیادہ محسوس نہ ہوتی ہو لیکن اب جبکہ ہم آزاد ہیں اور اس کی ضرورت ہے کہ ہماری سوسائٹی کا کوئی جز ایسا نہ ہو جو قومی دھارے سے الگ رہ کر تنہائی اور گوشہ گیری کی زندگی بسر کرے اور اس کے وجود اور شخصیت سے جو توقعات ہو سکتی ہیں ان کی تکمیل نہ کرے تو یہ صرف کسی ایک جز کا نہیں بلکہ کل کا نقصان ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قوم استعمار کی گرفت

سے آزاد ہونے کے بعد سب سے پہلے اپنے نظام تعلیم پر توجہ کرتی اور جب ضرورت و موقع اس میں ادل بدل کرتی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے ہم جائزہ لیتے ہیں تو اسلامی مدارس کے نصاب میں متعدد خامیاں اور نقائص نظر آتے ہیں۔ ان نقائص کو مندرجہ ذیل عنوانات کے ماتحت بیان کیا جا سکتا ہے:

(۱) مدت درس

(۲) علوم درس

(۳) کتب درسیہ

(۴) طریق درس۔

مدت درس۔ مدارس عربیہ میں مدت درس عام طور پر آٹھ برس ہوتی ہے۔ اس میں کسی قسم کی درجہ بندی نہیں ہوتی۔ پوری تعلیم ختم ہونے کے بعد فارغ التحصیل کو ایک سند دے دی جاتی ہے۔ اس کا نہ کوئی ٹائٹل ہوتا ہے اور نہ نام۔ اصول تعلیم کے لحاظ سے یہ طریقہ غلط ہے۔ تعلیم کے مختلف مدارج ہونے چاہئے۔ مثلاً ابتدائی، وسطیٰ، علیا، پھر علیا کے بھی دو حصے ہونے مناسب ہیں۔ ایک علیا (الف) اور دوسرا علیا (ب) اور ان دونوں کا الگ الگ نام مقرر کر کے مثلاً عالم اور فاضل ان کی مدت تعلیم تعین اور ان کا ایک مستقل امتحان ہونا چاہئے۔ علیا کے بعد ایک درجہ تخصص کا ہونا ضروری ہے۔ تاکہ جو طالب علم کسی ایک خاص فن میں درک و کمال حاصل کرنا چاہتا ہے وہ کر سکے اور ہر مرحلہ کی تکمیل کے بعد یہ محسوس کر کے اس میں خود اعتمادی پیدا ہو کہ اس نے اپنے سفر کی ایک منزل طے کر لی ہے۔ تعلیم کے ان مراحل و منازل اور ان کے مقاصد کے پیش نظر ہی مدت تعلیم کا تعین ہونا چاہئے۔ یہ کل مدت چودہ برس بھی ہو سکتی ہے اور سولہ برس بھی۔

علوم درس:۔ مدارس میں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں ان میں عقلیہ بھی ہیں یعنی منطق، فلسفہ اور ہیئت۔ یہ سب علوم مولانا حالی کے بقول اب یونان کا دفتر پارینہ ہو چکے ہیں۔ ان کی افادیت علمی اور تحقیقی اعتبار سے غیر معتبر قرار پا چکی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی تعلیم پر ایک طالب علم کا بہت کافی وقت صرف ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کو خارج کر کے ان کی جگہ علوم جدیدہ رکھے

جائیں۔ تاکہ مدارس عربیہ کے فارغ التحصیل آج کل کے اہل علم سے ان کی زبان میں گفتگو کر سکیں۔ البتہ چونکہ ہمارے اسلاف کی بعض کتابوں کا سمجھنا قدیم منطق اور فلسفہ کے جاننے پر موقوف ہے اس لئے ان دونوں علوم کا ایک مختصر نصاب جو ایک برس میں ہی پورا ہو جائے اگر شامل درس رہے تو چنداں مضائقہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں منطق میں صغریٰ اکبریٰ اور مرقاۃ اور فلسفہ میں ہدیۂ سعیدیہ اور میبذی بہت کافی ہیں۔

کتب درس:۔ علوم عقلیہ کے علاوہ علوم کی باقی دو قسمیں یعنی علوم نقلیہ اور علوم آلیہ جو پڑھائے جاتے ہیں تو ان کی ضرورت اور افادیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان علوم کی تعلیم کے لئے جو کتابیں نصاب میں رکھی گئی ہیں۔ ان پر نظر ثانی کی شدید ضرورت ہے۔ مثلاً عربی صرف و نحو اور معانی و بیان کی تعلیم پر ایک طالب علم کا جو وقت صرف ہوتا ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ اور پھر بھی جو حاصل ہوتا ہے وہ بہت کم ہے اس سلسلہ میں کافیہ اور شرح جامی جیسی کتابیں نہ صرف غیر ضروری ہیں بلکہ اصل مقصد کے لئے نقصان رساں ہیں کیونکہ طالب علم کی ساری توجہ ان کتابوں کی ادق اور پیچیدہ عبارتوں کا مطلب سمجھنے پر مرکوز رہتی ہے۔ قاہرہ اور دوسرے ملکوں میں اب کثرت سے ایسی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ جو جدید فن کی تعلیم کا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

نظم کی کتابوں کا یہ ہے کہ یہ سب کتابیں پرانی و قیانوسی اور از کار رفتہ ہو چکی ہیں۔ حماسہ اور دیوان متنبی اور سبعہ معلقہ بیشک بہت اہم کتابیں ہیں لیکن ایک پوری کتاب کو شامل کورس رکھنے سے کہیں زیادہ بہتر یہ ہے کہ قدیم و جدید دواوین کے انتخابات پڑھائے جائیں تاکہ طالب علم عربی شاعری کے مختلف ادوار اور ان کی خصوصیات سے واقف ہو سکیں۔ نظم کے علاوہ نثر میں بھی یہ ہی ہونا چاہیئے۔ آج عربی نثر کی اعلیٰ سے اعلیٰ کتابوں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ ان سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ پھر ادب کے ساتھ تاریخ ادب نہ پڑھانا ایک حد درجہ افسوسناک کوتاہی ہے۔ اسی طرح نقد نثر و نظم پر بھی ایک دو

کتابیں ہونی ضروری ہیں۔ علوم دینیہ میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ ان پر بھی نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ موجودہ زمانہ میں جبکہ اصول فقہ اور اصول حدیث اور اصول تفسیر پر اعلیٰ سے اعلیٰ کتابیں دستیاب ہیں اصول الشاشی، نور الانوار، نخبۃ الفکر اور الفوز الکبیر پر اصرار کرنا روشن ضمیری کی دلیل نہیں ہے۔

طریق درس:۔ اب لیجئے طریق درس! تو اس میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ مدارس میں اساتذہ اور طلباء دونوں تمام تر توجہ کتابوں پر اور ان کے ضمائر کے مراجع اور عبارتوں کا مطلب علوم کرنے پر مرکوز رہتی ہے۔ گویا طالب علم فن نہیں پڑھتا۔ کتاب پڑھتا ہے اور اس کو سمجھ لینے کو ہی اپنے لئے معراج کمال جانتا ہے۔ میں بعض ایسے حضرات کو بھی جانتا ہوں جو اس پر فخر کرتے تھے کہ انھوں نے شرح جامی گیارہ مرتبہ اور مقامات حریری دس مرتبہ پڑھی ہے اور انھیں رٹا ہے۔ اسی طریق درس کا نتیجہ ہے کہ سب کچھ پڑھ لینے کے بعد بھی طالب علم کو فن نہیں آتا اور اس کا ذہن تخلیقی (CREATIVE) ہونے کے بجائے محض تقلیدی RECEPTIVE ہو کر رہ جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کو بدل کر لکچر دینے کا طریقہ رائج کیا جائے، اور طلبہ میں خود مطالعہ اور غور و فکر کا مادہ پیدا کیا جائے۔

اسلامی مدارس کے عام نصاب میں جو نقائص ہیں، اور جن کی اصلاح ضروری ہے۔ اس کا مختصر بیان تو ختم ہوا۔ اب اس سلسلہ میں مزید گزارشیں کرنا ضروری ہیں۔

۱۔ اوپر کہا گیا ہے کہ علوم عقلیہ کی جگہ علوم جدیدہ یا بالفاظ صحیح تر علوم عصریہ کا اضافہ ہونا چاہیئے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ علوم سب کے سب تو داخل نصاب ہو نہیں سکتے تو پھر کن علوم کا انتخاب کیا جائے؟ جواب یہ ہے کہ ظاہر ہے اسلامی مدارس کا مقصد انجینئر، ڈاکٹر، سائنٹسٹ، قانون دان اور ماہر تجارت پیدا کرنا نہیں ہے۔ اس بنا پر مدارس کے درس نظامی میں علوم جدیدہ میں سے صرف وہی مضامین داخل نصاب ہونا چاہیئے جو یونیورسٹیوں میں فیکلٹی آف آرٹس اور فیکلٹی آف سوشل سائنس کے تحت میں آتے ہیں، مثلاً اقتصادیات، فلسفہ، پالیٹکس، سائنس تاریخ، ریاضی، جغرافیہ، سوکس، ان کے علاوہ مدارس کے طلباء کو جنرل سائنس اور دینیات سے بھی ناواقف نہ رہنا چاہیئے۔ مذکورہ بالا علوم کے علاوہ انگریزی، جرمنی یا فرانسیسی زبان کا

جاننا اور اس کے ادب سے واقف ہونے کی بھی سخت ضرورت ہے کیونکہ یہ تینوں زبانیں علمی و ادبی ذخائر سے مالامال ہیں اور آج یہ عالم ہے کہ کسی ایک اسلامی یا دینی موضوع پر بھی ریسرچ ان تینوں میں سے کم از کم کسی زبان کے علم کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ عصر حاضر کے تقاضے کیا ہیں؛ اور دنیا کی ہوا کا رخ کیا ہے؛ اس کا بھی صحیح اندازہ کسی ایک ترقی یافتہ مغربی زبان کو جانے بغیر نہیں ہو سکتا۔

حضرات! میں نے اس مقالہ میں چند اصلاحی تجاویز پیش کی ہیں لیکن ان کا کوئی مکمل خاکہ پیش نہیں کیا۔ یعنی میں نے یہ نہیں بتایا کہ ابتدائی، وسطی اور علیا میں کون کون سے مضامین اور کس ترتیب سے پڑھائے جائیں۔ میرے لئے ایسا نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ نہایت مکمل اور مفصل طریقہ پر میں اپنے رفقائے کرام کی مدد و اعانت سے کر چکا ہوں اور وہ شائع بھی ہو گیا ہے۔ غالباً آپ حضرات کو علم ہوگا کہ جس زمانہ میں پروفیسر ہمایوں کبیر مرکزی وزیر اور سنٹرل وقف کونسل کے صدر تھے انھوں نے سینٹرل وقف کونسل کی ایک کمیٹی بنائی تھی جس کا کام وہی تھا جو آج کے مذاکرہ کا موضوع ہے۔ اس پہلی میٹنگ کو خود پروفیسر موصوف نے خطاب کیا اور مدارس اسلامیہ کے نصاب تعلیم کی اصلاح کی ضرورت پر پرمغز اور پرزور تقریر کی۔ اس کے بعد اس کمیٹی نے تشکیل نصاب کے لئے ایک سب کمیٹی بنا دی جو صرف تین افراد پر مشتمل تھی۔ خاکسار راقم الحروف کا اس سے تعلق یہ تھا کہ وہ کمیٹی اور سب کمیٹی دونوں کا ممبر تھا اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کئی ماہ کی سخت محنت کے بعد جب سب کمیٹی نے یہ نصاب بنا کر کمیٹی کے سامنے پیش کیا تو کمیٹی کی اس میٹنگ میں تعلیم جدید کے نمائندے پروفیسر فیضی پروفیسر محمد اجمل خان مسٹر اسد اللہ کاظمی اور تعلیم قدیم کے نمائندے مولانا محمد طیب دیوبند، مولانا محمد میاں فاروقی اور پرنسپل عبدالوہاب بخاری یہ سب موجود تھے۔ ان سب حضرات نے اس نصاب کی بڑی تعریف کی اور اسے منظور کر لیا۔ اس کے بعد جب یہ نصاب سینٹرل وقف کونسل کی میٹنگ میں پیش ہوا جس کی صدارت اب مسٹر فخر الدین علی احمد کر رہے تھے تو اس موقع پر پروفیسر ہمایوں کبیر نے پھر ایک پرزور تقریر کی اور جدید نصاب کی تشکیل پر اپنی غیر معمولی مسرت کا اظہار کرتے

ہوئے فرمایا کہ یہ نصاب مسلمانوں کی قدیم تعلیم کی تاریخ میں ایک نہایت اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور بڑی عجیب اور خوش آیند بات یہ ہے کہ اس کو قدیم اور جدید دونوں طبقوں کی منظوری اور رضامندی حاصل ہے۔ یہ نصاب سینٹرل وقف کونسل کی طرف سے میرے قلم سے چند صفحات کا مقدمہ کے ساتھ شائع کر دیا گیا ہے۔ اور ہر شخص اسے دیکھ سکتا ہے۔

حضرات: مدارس کے لئے جب نصاب جدید ہوگا تو اس کی تنقید کے لئے اور بھی بہت سی چیزیں کرنی ہوں گی۔ مثلاً مدارس کے لئے تعمیر۔ اساتذہ کی تنخواہیں طلباء کے وظائف طلباء کے رہن سہن کے طور طریقے۔ ان کے لئے کھیلوں اور ورزش کا انتظام۔ لائبریری۔ وغیرہ۔ ان تمام چیزوں میں بھی حسب موقع و محل اصلاح کرنی ہوگی اور اس کا خیال رکھنا ہوگا کہ جب طلباء اس نصاب کی تکمیل کر کے مدارس سے نکلیں تو سماج میں ان کی ایک وقیع حیثیت ہو اور ان کے لئے معاش کو حاصل کرنے کی بھی ایک دو نہیں متعدد اور باوقار راہیں کھلی ہوتی ہیں۔ اگر ہم یہ کر سکیں تو صرف ایک طبقہ ایک فرقہ کی خدمت نہیں ہو سکے گی بلکہ پورے ملک کی اور اس سے بھی بڑھ کر انسانیت کی اہم خدمت ہوگی۔

سعید احمد اکبر آبادی

ہمارا قدیم نصابِ تعلیم جو عربی مدارس میں ایک عرصہ سے رائج اور متداول ہے[1] تین قسم کے علوم و فنون پر مشتمل ہے۔ ایک علوم دینیہ جس میں تفسیر، حدیث، فقہ اور علوم القرآن وغیرہ داخل ہیں۔ دوسرا علوم آلیہ مثلاً صرف و نحو، معانی، بیان و بلاغت اور عربی ادب وغیرہ۔ تیسری قسم علوم عقلیہ کی ہے جیسے منطق، فلسفہ، ہیئت و ہندسہ وغیرہ۔ ہمارے جن بزرگوں نے یہ نصاب بنایا تھا۔ ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ اصل مقصد تو علوم دینیہ کی تعلیم ہے جن کی تحصیل کے بعد قوم میں علمائے دین پیدا ہوں اور اپنے علم و عمل سے مسلمانوں کی مذہبی رہنمائی کی خدمت انجام دیں، اسلامی علوم و فنون کی تبلیغ و اشاعت کریں اور اگر اسلام کی تعلیمات پر کسی طرف سے کوئی اعتراض ہو تو وہ اس کا خاطر خواہ جواب دے سکیں۔

ہندستان میں جب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے اقتدار اور ان کی حکومت کے قیام کے بعد ملک کے حالات میں عظیم تبدیلی پیدا ہوئی تو اس تبدیلی کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ ملک میں انگریزی اور مغربی علوم و فنون کا رواج ہوا اور اس کے نتیجہ میں جدید افکار و خیالات کی ایک نئی دنیا آباد ہوئی۔

ہمارے عربی مدارس جو اس انقلابِ عظیم کے بعد قائم ہوئے ان کا چونکہ اساسی مقصد مسلمانوں کو مذہبی اعتبار سے اس سیاسی انقلاب کی زد سے محفوظ

[1] وقف کونسل کے مرتبہ نصاب کا مقدمہ، مشمولہ ذکر سیمینار کے مقالے

رکھتا تھا اس بنا پہ انھوں نے افکار و نظریات کے اس تغیر و تبدل اور اس کے علمی و تعلیمی اسباب کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور اس بنا پر اپنے اس قدیم نصاب تعلیم پر قناعت کئے رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں علوم دینیہ کے بڑے بڑے فاضل اور ماہر علمار پیدا ہوئے جنھوں نے تصنیف و تالیف درس و تدریس، وعظ و ارشاد اور افتا کے میدانوں میں اہم اور یادگار خدمات انجام دیں، ایسے مشائخ پیدا ہوئے جن کی روحانی تربیت اور باطنی تعلیم و تلقین سے ہزاروں مسلمانوں نے فیض پایا۔ بہت سی جاہلانہ رسومات جو ان کی سماجی زندگی کا جزو ہو گئی تھیں ان کی اصلاح کی اور ملک میں مذہب کا وقار باقی رکھا لیکن اس کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں میں قدیم تعلیم یافتہ اور جدید تعلیم یافتہ کے نام سے دو مستقل گروہ پیدا ہو گئے جو باہم ایک دوسرے کے رقیب تھے، بعض حضرات نے ملی اور قومی مفاد کے پیش نظر اس خلیج کو پر کرنے کی سعی کی، لیکن اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔ اور صورت یہ ہو گئی کہ جو حضرات کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل ہوتے تھے وہ مذہب اور اس کے علوم و فنون سے نا آشنا اور بے خبر تھے۔ اور اسی طرح جو حضرات طبقۂ علمار میں شمار ہوتے تھے انھیں نہ انگریزی زبان سے واقفیت تھی اور نہ کسی مغربی علم و فن سے۔ اس بنار پر اول الذکر طبقہ مغربی افکار و نظریات سے غیر معمولی حد تک متاثر ہونے کے باعث مذہب اور اس کی روایات سے دور ہو گیا۔ اور دوسری جانب ہمارا طبقۂ علمار وقت کے تقاضوں اور جدید مطالبات سے ناواقف رہا۔ اور تعلیم یافتہ طبقہ پر اس کے اثرات روز بروز کمزور ہوتے رہے۔ علاوہ ازیں عصر حاضر کے علمی رجحانات اور فکری امتیازات سے انجان رہنے کے باعث اس طبقہ کو فکر و نظر کے میدان میں جو رہنمائی دینی چاہیے تھی وہ نہ دے سکا، اس میدان میں اس کی عاجزی اس حد تک پہونچ گئی کہ نہ وہ خود عصر جدید کی زبان میں گفتگو کر سکتا تھا اور نہ اپنی زبان کسی کو سمجھا سکتا تھا، یورپ کی مختلف زبانوں میں مستشرقین کی اور بعض خود مسلمان علمار و فضلار کی کوششوں سے اسلامی علوم و فنون کا عظیم الشان ذخیرہ جمع

ہوگیا ہے اور اس بنا پر آج عالم یہ ہے کہ کسی خالص اسلامی موضوع پر بھی ریسرچ اور تحقیق کا حق انگریزی فرانسیسی یا جرمنی زبان سے واقفیت کے بغیر ادا نہیں ہو سکتا۔ ہمارا یہ طبقہ اس عظیم ذخیرہ سے بے خبر تھا اور جب وہ اس کا علم ہی نہیں رکھتا تھا تو اس پر نقد و تبصرہ کی توقع اس سے کیونکر ہو سکتی تھی یہاں مزید تفصیل کی ضرورت نہیں ہے لیکن ہر حساس اور صاحب فکر و نظر مسلمان اچھی طرح جانتا ہے کہ اس صورت حال کے باعث نہ صرف مسلمان کو بہ حیثیت ایک فرقہ کے بلکہ خود اسلام کو کس درجہ عظیم نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی عرصہ دراز کی مسلسل جد و جہد اور کوششوں کے بعد ہی ہو سکتی ہے۔

خوشی کی بات ہے گذشتہ جنگ عظیم دوم کے بعد سے ایشیا اور افریقہ میں آزادی کا نیا دور شروع ہوا اور ہر ملک میں تعمیر و تنظیم، تعلیم اور دوسرے قومی مسائل کی از سر نو تشکیل کی طرف عام توجہ مبذول ہوئی تو جہاں تک مسلمانوں کے معاملات و مسائل کا تعلق ہے علماء میں مدارس عربیہ و دینیہ کے قدیم نصاب تعلیم کے نقص کا قوی احساس بھی پیدا ہوا۔ اور اس نقص کو دور کرنے کی غرض سے اصلاحی کوششوں کا آغاز ہوا۔ چنانچہ گذشتہ چند برسوں میں مسلم ممالک میں عموماً اور عرب ممالک میں خصوصاً ان مدارس میں جو تعلیمی اور تنظیمی اصلاحات ہوئی ہیں، انھوں نے ان مدارس کو ایک نئی شکل و صورت اور ایک نئی تب و تاب بخشی ہے، یہ سب کوششیں ایک ہی قسم اور ایک ہی نوعیت کی نہیں ہیں، کہیں افراط بھی ہے اور کہیں تفریط بھی۔

یہاں ان کے تفصیلی جائزہ لینے اور ان پر نقد و تبصرہ کرنے کا موقع نہیں ہے ان کے ذکر سے مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کے مدارس دینیہ کی اصلاح کا مسئلہ اب کوئی ایسی مخفی حقیقت نہیں ہے جس کا احساس صرف چند ارباب فہم و بصیرت تک محدود ہو بلکہ اب یہ احساس عالمگیر ہے اور اس سلسلہ میں ہر جگہ اقدامات ہو رہے ہیں۔

ہمارا ملک ایک وسیع ملک ہے جس میں چھ کروڑ کے لگ بھگ مسلمان آباد ہیں ان کے جو مدارس عربیہ ملک کے اطراف و اکناف میں پھیلے ہوئے ہیں،

ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے اور یہ ہندستان کے مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے کہ تقسیم سے قبل جن مدارس کو مرکزی اور نمایاں حیثیت تھی اور ۱۸۵۷ء کے بعد اس ملک کے مسلمانوں کی دینی اور ثقافتی زندگی کی تعمیر و تشکیل کی راہ میں جن مدارس نے بہت اہم رول ادا کیا تھا وہ اکثر و بیشتر تقسیم کے بعد بھی ہندستان میں ہیں اور اپنے فرائض باحسن وجوہ انجام دے رہے ہیں، اب ضرورت ہے کہ ان مدارس کی اصلاح کی طرف بھی توجہ کی جائے تاکہ جدید حالات اور نئے قومی و بین الاقوامی مطالبات کے پیش نظر آج جس قسم کے علمار کی ضرورت ہے وہ ان مدارس سے پیدا ہوسکیں اور ان مدارس کی افادیت کا دائرہ وسیع تر ہو۔

جہاں تک مدارس کی اصلاح کے مقصد اور غرض اساسی کا تعلق ہے اس بارے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہونا چاہئیے کہ مدارس کی غرض وغایت انجینیر ڈاکٹر یا علوم جدیدہ کے ماہر پیدا کرنا ہرگز نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد علمائے دین ہی پیدا کرنا ہے۔ اور اصلاح سے غرض صرف یہ ہے کہ یہ علماء دین وہ ہوں جو پاک و صاف عملی زندگی کے ساتھ ایسی علمی استعداد بھی رکھتے ہوں کہ وہ عصر جدید کی زبان سمجھ سکتے اور اس میں اپنی بات سمجھا سکتے ہوں علوم جدیدہ سے اپنی ضرورت کے مطابق استفادہ کرنے کی صلاحیت سے محروم نہ ہوں اور شہری زندگی میں اپنی ضروریات کسی دوسرے کی مدد کے بغیر خود پوری کر سکتے ہوں۔

علاوہ ازیں ہم اپنے قدیم نصاب تعلیم پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس میں چند اور نقائص نظر آتے ہیں مثلاً:

(۱) علوم دینیہ کی تعلیم کے لئے جو کتابیں اور جس ترتیب سے رکھی گئی ہیں وہ مقصد کے حصول کے لئے کافی نہیں ہیں، پھر ان کا جو طریق تعلیم ہے وہ بھی ناقص ہے، طالب علم کا واسطہ صرف کتاب سے رہتا ہے فن سے نہیں۔ اس بنار پر کتاب کی جزئیات پر وہ حاوی ہوتا ہے لیکن فن کے اصول و فروع اور اس کے آداب و مبادی پر اس کی نظر نہیں ہوتی۔

۲۔ علوم آلیہ یعنی صرف نحو، معانی بیان و بلاغت اور عربی ادب وغیرہ۔ اس سلسلہ میں دو قسم کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ایک طریق تعلیم میں اور دوسری

کتب درسیہ ہیں۔ اول الذکر میں اس لئے کہ ہمارے طلباء عربی ادب میں مقامات، سبعہ معلقہ اور دیوان متنبی وغیرہ پڑھ جانے کے باوجود عربی زبان میں نہ لکھ سکتے ہیں اور نہ بول سکتے ہیں؛ اب رہیں کتب درسیہ تو ظاہر ہے عربی ادب پر اب بہتر سے بہتر کتابیں یا ان کے منتخبات چھپ کر آ گئے ہیں یہی حال صرف ونحو اور معانی وبیان کا ہے۔ تو پھر ان کتابوں سے کیوں نہ استفادہ کیا جائے جن سے علوم آلیہ کے درس کے مقصد کی تکمیل زیادہ بہتر طریقہ پر ہو سکتی ہے۔

(۳) علوم عقلیہ کے سلسلہ میں جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں وہ کوہ کندن وکاہ برآوردن کا مصداق ہیں۔ ایک طالب علم کی عمر کا بہترین حصہ اس کی تحصیل وتعلیم پر خرچ ہوتا ہے لیکن ان کا فائدہ کچھ نہیں۔ اگر ان علوم کی جگہ جدید معاشرتی یا فطری علوم وفنون (SOCIAL & NATURAL SCISNCES) کی تحصیل میں سے وہ علوم وفنون پڑھائے جائیں جن کی آج کل سخت ضرورت ہے اور جن کے بغیر آج کل کی اصطلاح میں کسی شخص کو تعلیم یافتہ کہنا مشکل ہے تو ہمارے مدارس عربیہ کے فارغ التحصیل حضرات آسانی سے علوم قدیمہ کے ساتھ علوم جدیدہ سے بھی آشنا ہو سکتے ہیں۔

سینٹرل وقف کونسل، نئی دہلی نے اپنی میٹنگ منعقدہ ۲۷ و ۲۸ فروری ۱۹۶۵ء میں پروفیسر ہمایوں کبیر صاحب چیرمین سینٹرل وقف کونسل سے درخواست کی کہ وہ ایک ایسی کمیٹی بنائیں، جو ملک کے مدرسوں و مکتبوں کی موجودہ تعلیمی حالت کا جائزہ لے اور ان مدارس کی اصلاح اور ترقی کے لئے سفارشات پیش کرے۔ پروفیسر موصوف نے اس تجویز کے مطابق ایک کمیٹی کی تشکیل کر دی۔ کمیٹی نے موضوع زیر بحث کے متعلق تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد ایک اپنی سب کمیٹی مقرر کی جس کے لئے ممبر حضرات ذیل تھے۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی۔ مولانا سید علی نقی نقوی۔ مولانا ابو عرفان ندوی۔ اور کمیٹی مندرجہ ذیل نتیجہ پر پہنچی]

"ہم نے مدت تعلیم سولہ سالہ رکھی ہے۔ یہ اس مفروضہ پر مبنی ہے کہ ہمارے یہاں جو طلباء آئیں گے وہ پرائمری ایجوکیشن کی تکمیل کے بعد آئیں گے ہم نے اس سولہ سالہ سال کی مدت کو چار حصوں پر تقسیم کیا ہے۔

۱۔ شروع کے ۵ سال پرائمری (مکتب)
۲۔ "ثانویہ" جس کی مدت ۵ سال ہوگی۔
۳۔ "عالمیہ" جس کی مدت ۴ سال ہوگی۔
۴۔ تخصص" جس کی مدت ۲ سال ہوگی۔

ہمارا "ثانویہ" ہائی اسکول کے برابر ہوگا۔ "عالمیہ" بی۔اے کے مساوی اور "تخصص" ایم۔اے کے مساوی ہوگا۔ نصاب کی تشکیل میں یہ اصول پیش نظر رکھا گیا ہے کہ "ثانویہ" کے درجہ تک سب طلباء کو دینیات اور عربی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید مضامین مثلاً ہندسی حساب جغرافیہ، اردو، فارسی اور آخر کے درجات میں تاریخ و سائنس اور انگریزی بھی اس حد تک پڑھا دیئے جائیں کہ ایک ہائی اسکول کے طالب علم کو ان مضامین میں جو قابلیت حاصل ہوتی ہے، وہ ہمارے یہاں کے طلبا کو بھی حاصل ہو، ایک مضمون کے گھنٹے تدریجی طور پر مختلف سالوں میں گھٹتے بڑھتے رہے ہیں اسی بناء پر تعلیمی اوقات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا جس کی وجہ سے طالب علم کے دماغ پر غیر معمولی بوجھ پڑتا مگر ان مضامین سے واقفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد "عالمیت" میں بنیادی علوم و فنون تو علوم عربیہ و دینیہ ہی ہیں لیکن قدیم نصاب تعلیم میں علوم عقلیہ یعنی منطق۔ فلسفہ اور ہیئت وغیرہ پر جو وقت صرف ہوتا تھا اس کو ہم نے جدید علوم کی تعلیم کے لئے لیا ہے اور اس طرح اس نصاب کو پڑھنے کے بعد ایک طالب علم جب عالمیت کا امتحان پاس کرے گا تو اس کو علوم دینیہ و عربیہ میں بصیرت کے ساتھ جدید علوم میں بھی دسترس ہوگی۔ عالمیت سے فراغت کے بعد دو سال تخصص کے ہیں تخصص پانچ مضامین میں ہوگا چونکہ اسمیں پوری توجہ مضمون متعلقہ پر ہوتی ہے اسی بناء پر اس مضمون کیساتھ کسی دوسرے مضمون کی تعلیم نہیں دی جا سکتی لیکن خود اس مضمون کو اتنی وسعت دی گئی ہے کہ اس کو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ہر حصہ کیلئے الگ الگ ایک پرچہ۔ انمبر کا رکھا گیا ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ تخصص میں تفسیر حدیث فقہ کے علاوہ عربی ادب اور تاریخ میں بھی تخصص رکھا گیا ہے اور یہ اسلئے ہے کہ عالمیت کی تکمیل کے بعد ایک طالب علم کو علوم دینیہ و عربیہ ایک بڑی حد تک تو آہی جاتے ہیں اب اس کے

بعد اگر غیر دینی علوم میں یعنی تاریخ یا عربی ادب میں مہارت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کیلئے اس کا امکان پیدا کیا گیا ہے۔ یہ گنجائش اس لئے رکھی گئی ہے کہ طلباء اپنے اپنے ذوق کیمطابق علمی ترقی کر سکیں

محمد شفیع اگوانی[1]

مدرسوں کا وجود اتنا ہی قدیم ہے جتنی خود اسلامی تاریخ، لیکن اس سے مراد آپ مدرسوں کا وہ نظامِ تعلیم نہ لیں جو آج ہندوستان میں رائج ہے۔ اوّل الذکر اس اُبھرتی ہوئی تہذیب کی پیداوار تھے، جو انسان کی روحانی اور مادّی دونوں ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے اور جن میں علم کا افق وسیع تر کرتے رہنے کی لگن تھی۔ ثانی الذکر اس ہمہ جہتی زوال کے آئینہ دار ہیں جس کے جلو میں سیاسی خلفشار تھا اور علم و دانش کا انتشار بھی۔ درسِ نظامی جو ہندوستانی مدارس کی اکثریت قبول کیے ہوئے ہے ملّا نظام الدین (م ۱۱۶۱ء ۱۷۴۸ء) نے مرتب کیا ہے، جو مغل عہد کے آخری دنوں کی بات ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی بات جو میں کہنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ ہندستانی مدرسے، ان کے نصاب اور ان کا طریقۂ تعلیم، ان میں قدیم مدارس کی روش سے قطعی انحراف ہے۔ ابن خلدون نے مقدمہ میں علوم اسلامیہ کو علوم طبیعیہ اور علوم نقلیہ میں تقسیم کیا ہے، ایک عمومی تقسیم علم لدنی اور علم عقلی کی بھی تھی۔ علوم عقلیہ میں ریاضیات، طب

---

[1] پروفیسر ایم۔ ایس۔ اگوانی، انڈین اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز، نئی دہلی میں "مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ" کے شعبہ کے صدر۔ دنیائے عرب کی موجودہ صورت حال پر استناد کا درجہ رکھنے والے دو چار ہندستانی مسلمانوں میں سے ایک ہیں۔ ہندستانی مسلمانوں کے بارے میں ہمدردانہ اصلاحی نقطۂ نظر اور ان کے مسائل پر مستقل سوچ بچار کرنے والے ممتاز ترین مفکروں میں سے ایک۔

طبیعیات، کیمسٹری، ہیئت اور زراعت کے علوم شامل تھے؛ علوم دینی میں تفسیر، حدیث، فقہ اور کلام شامل تھے۔ اس روش سے قطعی انحراف کرتے ہوئے درس نظامی میں علوم تقلید بھرے پڑے ہیں، اور دنیوی علوم تقریباً صفر کا درجہ رکھتے ہیں۔

ہم اندازہ کرسکتے ہیں کہ عہد وسطیٰ میں کوئی بھی تعلیمیافتہ مسلمان ایک بھرپور، ہمہ جہت نظام تعلیم کا پروردہ ہوتا تھا، اور کوئی معقول وجہ نہ تھی کہ وہ ایک اچھا مسلمان نہ بن جائے، اور ساتھ ہی اپنے کو معاشرے کا ایک مفید رکن ثابت نہ کرپائے۔ اس نظام تعلیم نے بڑے بڑے فقیہہ، متکلم، طبیب، سائنسداں، ماہرِ ریاضیات، سیاستداں، اور ادیب پیدا کیے، انھیں میں ابوحنیفہ، غزالی، ابن سینا، البیرونی، خیام، ابن خلدون، امیر خسرو، ابوالفضل اور فیضی جیسے مشاہیر بھی ہیں۔
یہ بات آج ہم اپنے مدرسوں سے نکلے "تعلیم یافتہ" مسلمان کے بارے میں نہیں کہہ سکتے؛ وہ دین کے بارے میں تو کچھ جان لیتا ہے لیکن خود اپنے طبیعی اور معاشرتی ماحول کے بارے میں اس کا علم تقریباً نہیں کے برابر ہوتا ہے؛ کوئی ایسا ہنر بھی ہاتھ میں نہیں آپاتا کہ وہ سماج کا منفعت بخش رکن بن سکے۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ وہی وہ معتمد اور دانشور قرار پاتا ہے، جس سے ناخواندہ مسلمان رہنمائی اور مشورہ کے لیے رجوع کرتے ہیں!!

دوسرے یہ کہ: خالص مذہبی نقطۂ نظر سے بھی ان مدرسوں نے اسلامی فکر کی توسیع و ترقی میں مدد بہم پہنچانے کی جگہ کچھ رکاوٹیں ہی ڈالی ہیں۔ ۱۸ ویں ۱۹ ویں صدیوں میں جب مغل روبہ زوال تھے، مسلمان نے اپنے چاروں طرف سے زمین کھسکتی پائی۔ کچھ اور بچانے کی نہ سکت تھی نہ عزم، اس لیے اُس نے سوچا کم سے کم مذہب ہی بچالو۔ ایسے بحرانی دور جب بھی آتے ہیں، لوگ سکہ بند یا ڈھلے ڈھلائے مجموعۂ عقائد (DOGMA) کو زندہ عقیدہ سمجھ بیٹھتے ہیں، سائے کو وجود خیال کرلینے لگتے ہیں! مدارس کا نظام تعلیم منجملہ اُن بہت سی تدابیر کے ایک تدبیر تھا، جو علما نے سکہ بند عقیدہ کی حفاظت اور اس کی تبلیغ کے لیے اختیار کیا۔

یہ سب سمجھ میں تو آتا ہے، یہ اور بات ہے کہ تاریخ اسے معاف نہ کرسکے؛ لیکن یہ تو عام سمجھ سے بھی فروتر رہ جاتا ہے کہ ہندستان میں ہر طرف پچھلے سو سال میں، اتنی

ساری تبدیلیاں ہو رہی ہیں، لیکن اپنی کھال میں مست نظامِ مدارس پر اُن کا مطلق اثر بھی نہیں، یہ کیا قصہ ہے؟ مسلمانوں میں سماجی اور دینی اصلاح کی متعدد تحریکیں چلیں، دارالعلوم دیوبند نے ہندستان کی جنگِ آزادی میں اہم رول ادا کیا، یہ سچ ہے، لیکن مدارس کے بارے میں بالعموم یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ خود دیوبند نے اس امر کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں دی کہ اُن لبرل اور انسانی اصولوں پر جو تمام مہذب، متمدن اور ترقی پسند امتوں میں مشترک ہیں، مسلمانوں کی سماجی اور معاشی زندگی کی کس طرح تعمیر نو کی جائے۔ عہدِ جدید کے مسلمان مفکروں — جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہٗ، سید احمد خاں — نے اپنی تحریروں اور اپنے عملی کاموں سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اسلام کسی طرح جدید علوم اور انسانی معاملات کی عقلی ترتیب و تنظیم سے غیر ہم آہنگ نہیں ہے۔ روایتی طریقۂ تعلیم یا تو اسلامی افکار کے اس حرکی حصہ سے محض بےخبر رہا یا خوفزدہ (ALLERGIC)

ہمارے مدارس کا یہ رجحان بھی کچھ کم حیرت خیز نہیں ہے کہ علوم اسلامیہ کو اُن از کار رفتہ اور پارینہ دفتروں کی مدد سے پڑھایا جاتا ہے جو نصاب کی کتابیں کہلاتی ہیں، مدرسوں کا نصاب دیکھ کر قطعی طور سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ جب سے قدما ان موضوعات پر کچھ لکھ گئے ہیں اس کے بعد سے دنیا میں کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ یہ فقہ اور دینیات ہی پر موقوف نہیں، ادبی تنقید، میڈیسن، ہیئت، اور ریاضیات تک یہی حال ہے۔ قدما کے ساتھ اسی سادہ لوح وابستگی کا نتیجہ ہے کہ جدید عربی ادب اور جدید فارسی ادب کا بھی قطعی مطالعہ نہیں کیا جاتا؛ یا تو ان پر قدغن ہے یا محض سرسری تذکرہ ہو جاتا ہے!

یہ سب کچھ تصویر کی بیرنگی کو بڑھاتا جا رہا ہے۔ نظامِ مدارس نہ تو مذہبی روشنی دے پاتا ہے نہ مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کو روزانہ زندگی کے مسائل کو گرفت میں لینے کے قابل بناتا ہے؛ اس کے برخلاف، یہ مسلمانوں کی ایک بڑی اکثریت کیلیے جو ہنوز اس کے ارادتمند ہیں، مذہبی، معاشرتی اور ذہنی ترقی کی راہ میں ایک دیوار بنجاتا ہے؛ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ حاضر و موجود سے آنکھیں بند کرا کے، اور اس پر لعنت بھیج کر، مسلمانوں کو اس کے خیالی ماضی کی طرف لوٹا رہے؛ یہ نہ اس کی روحانی زندگی کو

ثروت مند بنا پاتا ہے، نہ اس کی دُنیوی فلاح کو ملحوظ رکھتا ہے۔

میری حقیر عرض ہے کہ تمام سوچنے والے مسلمان نظام مدرسہ کی تنظیم نو اور اس کے نصب العین کی تعریف نو پر سنجیدگی کے ساتھ کچھ سوچیں!
جہاں تک نصب العین کی بات ہے، کوئی تعلیمی نظام، مذہبی ہو یا عمومی، مفید اور اثرانداز نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ اپنے متعلموں میں آزاد فکر اور خود اعتمادی پیدا نہیں کرتا۔ اگر کلام خداوندی کو انسان کی زندگی میں ایک زندہ اور توانا حقیقت بننا ہے، تو انسان کو، خدا ہی کی عنایت کی ہوئی صلاحیتوں کی مدد سے، اسے سمجھنے اور تاویل و توجیہہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ معاصرین یا قدما کی اندھی تقلید، خواہ وہ کیسے ہی امتیاز کے حامل ہوں، عقیدہ کی روح کو کھا جاتی ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ لوگ بھی جو محض دینی عالم اور مبلغ بننا چاہتے ہیں انھیں بھی معاشی طور سے خود کفیل ہونا چاہیے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ بے تعداد مولوی اور مسجدوں کے امام محض اپنے روحانی مزارعوں سے حاصل کی ہوئی حقیر کمائی پر پلتے ہیں۔ گاؤں میں یہ زیادہ ہے جہاں اکثر لوگ ناخواندہ ہوتے ہیں اور مولویوں کے آگے سہمے رہتے ہیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے معیوب ہونے کے علاوہ مولویوں کی زلیست کا یہ طور عام ذہنوں پر کچھ اس قسم کا افسوسناک اثر چھوڑتا ہے کہ پھر وہ بھی خدا کی خدمت گذاری اور خود کفالتی کو دو متضاد اور متخالف حلقے سمجھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اِن مقاصد کی کامیابی کی بس یہی ایک صورت ہے کہ نصاب اور طریقہ تعلیم دونوں پر نظرِ ثانی کی جائے۔ نصاب میں اس طور پر توسیع ہو کہ مذہبی علوم کے ساتھ دنیوی علم بھی شامل رہیں۔ نئی نصابی کتابیں ایسے موزوں لوگوں سے تیار کروائی جائیں جو کلاسیکی اور ماڈرن دونوں اندازکے

علوم سے واقف ہوں۔

مولانا شبلی نعمانی نے ایک بار مدرسوں کے حفظ و تکرار والے طریقے پر سخت اظہار افسوس کیا تھا جو مدرسوں کے اساتذہ کا تنہا طریقۂ تعلیم ہے؛ اور مولانا کے زمانے سے بظاہر کوئی افاقہ تو ہوا نہیں ہے۔

آخر میں؛ ہمیں اس کا اندازہ ہو جانا چاہیئے کہ وہ دنیا جس میں ہم رہ رہے ہیں، اُس دنیا سے جس میں ہمارے اجداد بستے تھے، غیر معمولی مختلف دکھتا ہے۔ پہلے سیاسی حکمرانوں کا عام قاعدہ تھا کہ اپنے ذاتی مذہب کو اُس پورے خطّے کا مذہب قرار دیدیتے تھے، جس کے وہ حاکم ہوتے تھے؛ ہمارے زمانے کا رجحان یہ ہے کہ ریاستیں مذہبی امور میں دخل اندازی سے بچتی ہیں۔ یا پھر تمام مذاہب کو ایک سطح پر برتتی ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ مذہب اب ریاست کی 'مدخولہ' ہونے سے بچ گیا ہے۔ یہ ایک خوش آیند تبدیلی ہے، لیکن تمام مذاہب کے پیروؤں پر کچھ نئی ذمہ داریاں بھی ڈالتی ہے۔ ملے جلے ہم آہنگ سماجی، سیاسی اور معاشی اطوار کی ترقی کے لیے، ہر مذہب کے پیروؤں کو اپنے ساتھی شہریوں کے عقائد کے بارے میں بنیادی باتوں کا علم تو ہونا ہی چاہیئے۔ اسی لیے مذہبی علوم کے تمام اداروں کے لئے مذاہب کا تقابلی مطالعہ (COMPARATIVE RELIGIONS) اہمیت رکھتا ہے۔ مغرب کے عیسائیوں کو اس نکتہ کے سمجھنے میں اولیت کا شرف حاصل ہے؛ اگر ہم اس معاملے میں اس بیش قیمت مثال کی پیروی کریں، تو یہ اسلام کی اور خود اپنی بڑی خدمت ہوگی۔

سید اوصاف علی

ابھی تک ہم یہ نہیں طے کر پائے کہ ہماری تعلیم عربی مدارس میں جو تعلیم دی جاتی ہے، اس کی غرض وغایت اور مقصد کیا ہے؟

عبدالرحمٰن کشمیری[1]

یہ بات واضح کر دی جائے کہ یہ جو نصاب عربی درسگاہوں میں رائج ہے بحث اس حد تک محدود رہے گی، یا ایک جامع نصاب تعلیم اور پورا مقصد تعلیم جو قرآن کی روشنی میں اُمّتِ مسلمہ معین کرے اور اس کی منہاج، جو نبوت نے مقرر کی ہے، اس کی روشنی میں DISCUSSION ہو گی؟

سعید احمد اکبر آبادی

بات یہ ہے کہ سیمنار کے لیے جو موضوع رکھا گیا ہے تو وہ تو یہی ہے کہ "اسلامی مدارس کا نصاب ونظام اور جدید تقاضے"۔ اب اس میں ضمنی طور پر یہ بحث ہو سکتی ہے کہ مقصد کیا ہے، اسلامی مدارس کا، مگر وہ فقط ضمنی پس منظر بیک گراؤنڈ کے طور پر۔ اس لیے کہ جب آپ کو نصاب کے اوپر گفتگو کرنی ہے تو پہلے تو آپ کو یہ بتلانا ہوگا کہ اس کا مقصد کیا ہے جس کے لئے آپ نصاب درکار ہے، تو مقصد پر گفتگو آجاتی ہے۔ پھر نظام کا لفظ بہت کافی وسیع ہے، وسیع معنوں کے اندر مستعمل ہوتا ہے۔ اس میں مالی نظام بھی آجاتا ہے، تدریسی نظام بھی آجاتا ہے، تربیتی نظام بھی آجاتا ہے، اور بہت سارے نظام آجاتے ہیں تو اس طرح کی ہمہ جہتی گفتگو کے لیے تو وقت کم ہے۔

اس وقت مولانا عبدالسّلام خاں کا مقالہ جو آپ کے سامنے پڑھا گیا ہے اس میں بھی انھوں نے مختلف چیزوں کو لیا ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ نصاب اور مقصد تعلیم ان دو کے اوپر گفتگو ہو جائے۔

[1] عرصے سے دہلی میں مقیم جوشیلے اہلِ دل ہر درد مند مسلمان

عبدالرحمٰن کشمیری: مقصد کی نوعیت سے نصاب معیّن ہوتا ہے؛

سعید احمد اکبر آبادی: گویا پہلے مقصد کے اوپر گفتگو کر لیجئے، اس کے بعد

بیدار: الگ الگ بانٹنا مناسب نہیں۔

عبدالرحمٰن کشمیری: بحث بہت پھیل سکتی ہے، اس لئے اگر اس کو اور محدود کر دیں تو اس حد تک رکھیئے کہ عربی مدارس جو اس وقت قائم ہیں، وہ کیا مقاصد لے کر قائم ہیں، اور انھیں کی حد تک اس نصاب میں تھوڑی بہت اصلاح و ترمیم پر گفتگو کر لیجئے۔

علی اکبر ترمذی: تقاضوں کا مسئلہ ہے، وہ رہ جاتا ہے؛ جو سب سے اہم ہے؛

عبدالخالق نقوی: جو سب سے اہم ہے۔

علی اکبر ترمذی: مسئلہ جو ہے، وہ یہ ہے کہ جدید تقاضوں کے پیش نظر نصاب تعلیم ترتیب دینا ہے۔ اگر صرف یہی دکھا جائے کہ مقصد کیا ہے؟ اور نظام کیا ہے، اس کو رہنے دیا جائے، تو پھر تقاضوں کا مقتضا پورا نہیں ہوتا۔ تو تقاضوں کے ماتحت وہ مقصد بھی آجاتا ہے؛ تقاضوں کا جب ذکر کرتے ہیں تو مقصد یقیناً آجاتا ہے کیونکہ تقاضے جبھی ہوتے ہیں، جب مقصد ہوتا ہے: اور نظام تعلیم میں جیسا کہ مولانا نے ابھی کہا، مالی تنظیم، نصابی تنظیم سب آجاتی ہے۔

عبدالسلام قدوائی[1]: مقصد کا جہاں تک تعلق ہے، اسلامی علوم کو سمجھنا، سمجھانا اور اسلامی علوم کا تحفظ، یہ مقصد ہے ان کا۔ اس کے لیئے کتابیں۔

عبدالعلیم: جہاں جہاں تبدیلیاں اور اصلاحیں ہوئی ہیں، اگر وہ سب ایک جگہ جمع ہو جائیں تو گفتگو میں آسانی ہو جائے۔

عبدالخالق نقوی: بھوپال میں بھی نواب حمید اللہ خاں کے زمانے میں ایک ایسی کمیٹی بنی تھی جس کے ممبروں میں مولانا میمن، سید سلیمان ندوی، شبیر احمد عثمانی، مفتی کفایت اللہ، خلیل عرب اور مقامی علماء تھے۔ مقصد اوور ہال کرنا تھا۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ اب پرانی OUTMODED کتابوں کے رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کمیٹی کی سفارشات کو بھی منگوایا جائے۔

[1] جامعہ ملیہ میں دینیات کے استاد اور مشہور عالم

شبیر احمد خاں غوری ؒ :۔ اس سلسلہ میں ایک کوشش مولانا آزاد کمیٹی کی تھی، اور ایک کوشش رام پور کے مدرسۂ عالیہ کے ذیل میں بھی ہوئی تھی۔ ۵۸ء سے ۶۲ء تک، جب میں سبکدوش ہوا۔ میں بڑی بڑی اُمیدیں لے کر گیا تھا، مگر بڑا تلخ تجربہ ہوا۔

اصل میں طالب علم کے سامنے کوئی مستقبل نہیں ہے۔ ۱۹۴۶ء میں اس سلسلہ میں کمیٹی بنی تو میں نے مولانا آزاد کے سامنے سب سے پہلے یہی سوال رکھا کہ طالب علموں کا کیا حشر ہونا ہے، اور یہ کہ اس مادی دنیا کے اندر وہ کیا کریں؟ مولانا کے پیش نظر یہ تھا کہ حکومت کی سرپرستی میں یہ اصلاح ہو جائے۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ حکومت سے یہاں کے فارغ طلبا کو کیا امداد مل سکے گی۔

۶۰ کے قریب ایسے مدارس تھے جن کو حکومت سے امداد ملنی تھی۔ ان کے بارے میں مولانا کی خدمت ایک نقشہ پیش کیا گیا تھا کہ ان کی کس طرح امداد کی جائے۔ مگر مولانا ہم سے دور ہوتے گئے اور یہ مسئلہ یونہی پڑا رہا۔ اصل مسئلہ بہر حال طلبائے مستقبل کا مسئلہ ہے، اگر ان کی دنیا درست نہ ہوگی تو کوئی اصلاح کارآمد نہ ہوگی۔

سعید احمد اکبر آبادی :۔ میں جب کلکتہ جا رہا تھا تو مولانا آزاد نے کہا تھا یہ نصاب اپنے یہاں رائج کرنا۔ کئی سال تو مجھے مدرسے کو ٹھیک کرتے لگ گئے، پھر میں نے نیا نصاب اسی کی بنیاد پر بنا کے دیا مگر جیسے کہ گورنمنٹ کے کام ہوتے ہیں، وہی ہوا، پڑا رہا، اور وہاں بھی نافذ نہ ہو سکا۔

زید ابو الحسن فاروقی ؒ :۔ ان اصلاحات کو بنیاد بنا کر کوئی ایسا مدرسہ قائم ہو یا کوئی پرانا مدرسہ انھیں نافذ کر کے چلے اور اس کے فارغ التحصیل طلبا نکل کے سامنے آئیں تو امید ہے دیگر مدارس بھی اصلاح کر لیں گے۔

مدارس عربیہ بہر حال ضروری ہیں تا کہ قرآن وغیرہ پڑھے جاتے رہیں۔

محمد اجمل خاں : قرآن کی نزولی ترتیب پر تقریباً ۱۸ سال کے بعد ہمارے ان تمسن زغہ تو ہے انزل من قبلک کی بھی کوئی کتاب پڑھائی جاتی ہے؟ خود قرآن، اصل اللہ کا مصحف پڑھنے کے بجائے ہم عثمان کا مصحف پڑھتے ہیں،

ؒ علوم ۱۔ ۱۔ ہے مشہور عالم ۲۔ دہلی دور متنہ ستند ترین عالم دین

کس دور میں کیا حصہ نازل ہوا، یہ کچھ پتہ نہیں آخر میں لکھ دیکھو تی دین پڑھتے ہیں، کب یہ نازل ہوا، یہ معلوم نہیں۔

عبدالسلام قدوائی :- ہم تو آخر میں یہ پڑھتے ہیں" من شر الوسواس الخناس"

اجمل خاں :- اور یہ جانے بغیر کہ "خناس" کیا چیز ہے!

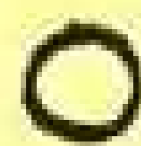
عبدالرحمن کشمیری

اصلاح کا عمل نیا نہیں، تمام مدارس میں رد و بدل ہوتے چلے آئے ہیں۔ ۱۸۹۰ء میں اس سلسلہ میں ہماری سب سے پہلی آواز اٹھی۔ تو تقاضوں کے تحت اصلاح ہوتی رہنی چاہیے بلکہ یہ اوپر سے ٹھونسی نہیں جا سکتی، البتہ یہ تجویز مشورے کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔

اس وقت پورے عالم اسلامی میں SACRED اور سیکولر کی ٹکر ہے نئی یونیورسٹیاں جو PRODUCTION دے رہی ہیں وہ انھیں دوسرے راستے پر لیجا رہی ہے۔ عالم اسلامی کی نئی نسل میں تشکیک پیدا ہو رہی ہے۔

سپاہ تازہ برانگیزم از ولایت عشق
۔۔۔۔ خلل از بغاوت خرد است

اس لئے ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ کس قسم کا انسان پیدا کرنا اور انسان سے کیا کام لینا ہے۔ دوسری طرف اسلامی تقاضے ہیں SYNTHESIS کرنا ہی قرآن نے جو کائنات اور انسان کا تصور پیش کیا ہے، اس کے پیش نظر انسان کی ذات سے تعلق رکھنے والے سارے علوم کو نہیں لینا پڑے گا۔ اس کے لیے ایسے ادارے ہی کام دے سکتے ہیں۔ جیسے مثلاً جامعہ ملیہ یا علی گڑھ، اس سلسلہ میں وہاں کے قواعد اور ملک کا دستور جس حد تک اجازت دیں، ہمیں کچھ کرنا چاہیے تاکہ عربی درسگاہوں کے طلباء ان سے استفادہ کر سکیں۔



کسی قوم کا مقصدِ تعلیم جو ہے وہ اس کے ملّی مقصدِ حیات سے پیدا ہوتا ہے، اور اس سے علیحدہ کسی قوم کا نصاب تعلیم نہیں بنایا جا سکتا۔

امتِ مسلمہ دنیا کے اندر خود اسلام پر قائم رہنے اور دوسروں کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے دُنیا میں آئی ہے؛ اور اسی مقصد سے اس کا نظام تعلیم بنتا ہے۔ ہمارے مدارس عربیہ کے اندر جو نصاب ہے اس میں صرف اتنا ہو کے رہ گیا ہے کہ کچھ مدرسین پیدا کر دیے کچھ امامت اور خطابت کے لیے۔ اس لیے نصاب تعلیم میں جو اصلاح خیال کا اظہار فرمایا گیا ہے اس سے کسی کو انکار نہیں۔ لیکن میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ جتنی بھی PHYSICAL SCIENCES وہ لازمی طور پر نصاب میں داخل کی جائیں؛ اور اس کے ساتھ ہی سائیکالوجی، جو LOGIC سے پہلے ہے، اور BIOLOGY پھر اس کے بعد منطق اور اس قسم کی جو چیزیں ہیں سب آئیں۔ طبیعی علوم سے، ان علمائے جنھوں نے فلسفۂ یونان پر سخت تنقیدیں کی ہیں، انھوں نے بھی کبھی انکار نہیں کیا۔ چنانچہ آپ حافظ ابن تیمیہؒ کی کتابیں اکٹھا کر دیکھیے، الٰہیات پر ان کی تنقید ہے، لیکن جہاں تک ریاضی کا تعلق ہے اور طبیعی علوم کا جہاں تک تعلق ہے "الرد علی المنطق" میں اور اپنی تمام کتابوں میں اس کی تائید اور توثیق کی ہے۔

اور پھر اس کے ساتھ انسان کے مطالعہ کے لیے پوری کائنات کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ انسان بجائے خود ایک 'MICROCOSM' ایک عالم صغیر ہے، چھوٹی سی کائنات؛ اس کا مطالعہ کرنے کے لیے پورے کائناتی علوم کو پڑھنا پڑتا ہے۔ تو جیسے بچے کو اپنے طبعی ماحول سے واقفیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور اس کے لیے نصاب میں طبیعی سائنس کی کتابیں ضروری ہیں، اسی لحاظ سے اس کے نصاب میں سماجی علوم کے جتنے بھی شعبے ہیں وہ سب کے سب داخل کیے جائیں، اسی کے ساتھ قرآن و سنت کی تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ قرآن مجید کو مرکز مان کر DIRECT METHOD پر قرآن کی عربی سکھائی جائے۔ لغت سکھائی جائے تو صرف قرآن کے الفاظ ROOT WISE ار بیج کر لیے جائیں، جیسا کہ کتابیں مرتب ہو گئی ہیں، کہ ایک مادّہ کے جتنے بھی الفاظ ہیں ان سب کو اسباق میں لا کر بچہ کی VOCABULARY اس طرح سے قرآنی VOCABULARY پہلے تیار کی جائے اور پھر قرآن ہی

سے صرف و نحو اور معانی اور بیان کے استقرائی طریقے سے اسباق تیار کیے جائیں، اس طرح سے ان کو عربی زبان بھی آجائے گی اور قرآن سے بھی واقفیت پیدا ہو گی۔ دوسرے درجہ میں آپ انھیں عربی ادب پڑھا سکتے ہیں، اور پھر قرآن و سنت کا تعلق قائم کر کے اس طرح سے حدیث کا مطالعہ بھی آپ کرا سکتے ہیں۔ پھر اس کے ساتھ فقہ اور جتنے بھی علوم اسلامیہ اس سے پیدا ہوتے ہیں، وہ سب کے سب۔ درجے قائم کرنے پڑیں گے: بنیادی تعلیم BASIC EDUCATION؛ اور پھر بنیادی تعلیم کو آگے جا کے پھیلا دیا جائے۔ مثلاً ایک بچہ نے قرآنی عربی پڑھی، دوسرے درجہ میں جا کر آپ اس کو عربی نثر و نظم سے واقف کرتے ہیں یا پھر اس کے بعد ایک درجہ آتا ہے کہ آپ شعرائے جاہلیت کے کلام سے اور نثر کے نمونے سے واقف کرتے ہیں۔ اس قسم کے مدارج قائم کر کے بنیادی تعلیم کو پھیلا کر کے آگے بڑھاتے چلے جائیں اور ہر علم کو قرآن مجید کے ساتھ SUBJECT WISE CORELATE کرتے چلے جائیں۔ قرآن مجید کو ترتیب دے کہ بچہ کو قرآن مجید سے واقف کیجیے۔ پھر قرآن کا سنت سے تعلق، اور پھر اسی طرح تفصیلات کرتے چلے جائیں۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ تعلیم بہت حد تک مفید ہو سکے گی۔ اور پرانے علوم عقلیہ کی جگہ اس وقت کے سارے علوم داخل کیے جائیں، البتہ METAPHYSICS فلسفہ الٰہیات جسے کہتے ہیں، تو جب تک قرآن و سنت اور ان علوم میں بصیرت نہ پیدا کی جائے، اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ کا بھی ایک درجہ آئے گا ــــــ

تو ایک بچّے نے بیسک تعلیم حاصل کر لی ہے، اس کے لیے وہی کافی ہے؛ آگے بڑھانا ہے تو اس کے لیے وہ کافی ہو گا۔ پھر جس بھی زندگی کے میدان میں جانا چاہے، انجنیئر بننا چاہے، ڈاکٹر بننا چاہے، آسانی سے جا سکتا ہے۔ البتہ دین کی تبلیغ کے لیے جن علما کو تیار ہونا پڑے گا ان کے لیے ــــــ

محمد اجمل خاں :ــ مولوی صاحب: انجنیری اور ڈاکٹری میں داخلہ نہیں ہوتا جب تک فرسٹ کلاس پری انجنرنگ یا پری میڈیکل نہ ہو۔ عربی پڑھ کے انجنرنگ میں کیسے چلے جائیں گے۔

کشمیری :- میں اس کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں کسی مکتب میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، میری الف سے لے کر پی تک ساری تعلیم کنڈر گارٹن سے لے کر

...... اب تک وہی ہے، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ تبلیغ کے لیے ان کو انبیا کی منہاج سیکھنی ہوگی۔ موجودہ سائنٹی فک میتھڈ سے واقفیت پیدا کرنی ہوگی پھر یہ اور پڑھے لکھے لوگوں کی جو کتابیں ہیں، یورپ میں جو تحقیقات کر رہے ہیں، ان سب سے واقفیت پیدا کرنی ہوگی۔ تو عصری تقاضوں کا مطلب اگر کوئی یہ سمجھے کہ اسلام موم کی ناک ہے کہ جس طرف چاہیں، زمانے کے ساتھ اس کو موڑ دیا جائے، اگر اگر کسی کو یہ غلط فہمی ہو تو میں اس کو دُور کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام دین ہے اور دین PERMANENT VALUES کا حامل ہے، اس کی مستقل اقدار ہیں، وہ زمان و مکان کے تغیر کے ساتھ نہیں بدلتی ہیں، زمان و مکان کے اندر جو تغیر ہوتا ہے وہ اور چیزوں میں ہوتا ہے۔ ان چیزوں اور تقاضوں سے کسی کو انکار نہیں، اس لیے عربی مدارس کے اندر علوم عقلیہ کا جہاں تک تعلق ہے، ان طبعی اور سماجی علوم کو ضرور داخل کیا جانا چاہیے اور اسی کے ساتھ ساتھ یورپ کی زبانیں، جن جن چیزوں کو مدارس والے ضروری سمجھیں وہ سب داخل کی جائیں۔

علی اکبر ترمذی[1]

کچھ ہم بحث سے ہٹ گئے ہیں۔ غرض و غایت اس سیمینار کی موجودہ زمانے کے جو تقاضے ہیں ان کے پیش نظر ہمیں غور کرنا ہے کہ ہمارا موجودہ تعلیمی نظام جو ہے کس حد تک ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اگر ہم اس سے ہٹ جائیں اور یہ سوچیں کہ یہ جو نظام ہے ٹھیک ہے، اسی کو رہنے دیا جائے، اس میں معمولی سی تبدیلی کر دی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم اپنے موجودہ زمانے کے تقاضوں پر غور نہیں کر رہے ہیں۔ سب سے پہلی چیز جو ہے، میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ تعلیم برائے تعلیم کوئی چیز ہے۔ تعلیم جو ہے وہ

زندگی کے لیے ہوتی ہے؛ ایک اچھا مسلمان بنانا؛ لیکن ساتھ ساتھ ایک اچھا مسلمان ایک اچھا شہری بھی ہوتا ہے۔ وہ ۲۴ گھنٹے صرف مسلمان نہیں رہتا؛ یہ

[1] اسسٹنٹ ڈائرکٹر، نیشنل آرکائیوز، نئی دہلی

دو علیحدہ ہیں جو آپس میں ٹکراتے نہیں ہیں، بلکہ جو مساوی ہیں گویا مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک شہری بھی ہوتا ہے، ایک اچھا انسان بھی ہوتا ہے تو ہمیں یہ بھی کوشش کرنی ہے کہ ایک طالبعلم کی جو شخصیت ہے وہ بھی اُبھرے، تعلیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچّہ کی شخصیت کو اُبھارنا، اس کو مواقع بہم پہنچانا۔ جب ایک شخص تعلیم پاتا ہے تو اس کا کچھ مقصد ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی طالب علم کی صلاحیتیں ایک اچھے انجینیر بننے کی ہوں، ایک اچھے ڈاکٹر بننے کی ہوں، تو کیا ضروری ہے کہ ہم اُسے ایک دینی تعلیم کا (THEOLOGIAN) بنا کے رکھیں۔ تو ہمیں یہ بھی سوچنا ہے کہ بچے APTITUDE کیا ہے۔ موجودہ تعلیم کا مقصد بھی یہ ہے کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ اس کا میلانِ طبع کیا ہے، اس کا رجحان کیا ہے۔ اگر ہم اُسے اس پر زبردستی ٹھونس دیں گے، نہیں، تمھیں تو مولوی بنانا ہے، یا واعظ بنانا ہے۔ یا ذاکر بنانا ہے، تو میں سمجھتا ہوں بچہ کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔ دوسری بات جو ہمیں غور کرنی ہے یہ ہے کہ دوسری قومیں کیا کر رہی ہیں۔؟ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے بھی مذاہب ہیں، ہندستان میں، وہ لوگ کیا کرتے ہیں؟۔ ایک موٹی مثال ہمارے سامنے عیسائیوں کی ہے۔ آخر عیسائی تو مسلمانوں سے زیادہ گویا کہ عیسائی ہوتے ہیں، وہ اپنا تعلیمی نظام کیسے چلاتے ہیں۔ آپ غور فرمائیں کہ CONVENT SCHOOLS میں جس طرح تعلیم دی جاتی ہے وہ دینی تعلیم بھی ہوتی ہے اور دُنیوی بھی: اور وہاں جو صاحب کہ پڑھاتے ہیں، چونکہ میں خود کانونٹ اسکول میں پڑھا ہوں، اور کچھ عرصے تک

پڑھایا بھی ہے، جیسے کہ مولانا فرمارہے تھے، آکسفورڈ کے ڈی۔فل۔ ہوتے ہیں، کیمبرج سے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، اور وہ ڈھائی سو روپیہ تنخواہ پاتے ہیں؛ ان کا ایک مشن ہوتا ہے، ان کا ایک مقصد ہوتا ہے۔ بچوں کے ساتھ وہ کھیلتے بھی ہیں، تماشے بھی کرتے ہیں، اور ان کے ساتھ اپنے آپ کو ملا لیتے ہیں، اس وجہ سے وہ بچوں کے اتنے قریب آجاتے ہیں کہ وہ ان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ میں کئی مرتبہ مدرسوں میں دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب جو ہیں، وہ صرف ان کو جو تنخواہ ملتی ہے، اس کی غرض سے پڑھاتے ہیں بچوں کو۔ تو ہمیں یہ بھی سوچنا

ہے کہ وہاں جو مدرسں ہیں، ان کے سامنے کوئی مشن ہے یا نہیں۔ اگر مشن ہے تو یقیناً کامیاب ہوں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دُنیوی تعلیم بھی بہت ضروری ہے، کیونکہ اگر ہم ایک شخص کو صرف ماہرِ دینیات بنا دیں تو وہ ہمارے معاشرے میں، ہماری سوسائٹی میں کس حد تک مفید ثابت ہوگا؟ آج جو فارغ التحصیل ہوتا ہے دیوبند سے یا کسی اور ادارے سے، وہ سماج اپنے آپ کو کس حد تک ADJUST کر لیتا ہے؟

میں کئی مرتبہ اس سلسلہ میں اپنے دوستوں سے بحث کر چکا ہوں، وہ اس کا اظہار کھلے بندوں کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، لیکن وہ دل میں یقیناً سوچتے ہیں۔ وہ اس معاشرے میں، اس سوسائٹی میں، MISFIT ہیں۔ اور اگر وہ تعلیم پانے کے بعد بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ MISFIT ہیں، تو یقیناً ہمارے نظام میں کسی قسم کی تبدیلی ضروری ہے تو کیوں ہم یہ کوشش نہ کریں کہ یہ جو CONVENT SCHOOLS ہیں، انھیں کے پہلو بہ پہلو یا اس سے کچھ قریب قریب ایسا نظام ترتیب دیں کہ بچے کی مذہبی تعلیم بھی ہو اور اُسے دُنیوی تعلیم بھی ملے۔

سکھوں کے یہاں جو خالصہ اسکول ہیں، ان کے یہاں ایک پیریڈ ہوتا ہے، جیسے وہ کہتے ہیں "دھارمک شکشا کا پیریڈ"، اس میں گرنتھ صاحب پڑھاتے ہیں، اور دوسری کتابیں پڑھاتے ہیں؛ وہ لازمی ہوتا ہے۔ آریہ سماجیوں کے یہاں بھی دھارمک شکشا کا ایک ایک پیریڈ ہوتا ہے، جس میں وہ مختلف مذہبی تعلیم دیتے ہیں۔ اگر ہم بھی اسی قسم کا نظام ترتیب دیں تو یقیناً میں سمجھتا ہوں کہ موجودہ زمانے کے تقاضوں کے مطابق اسے پورا کر سکیں گے، کیوں کہ اگر ہم یہ نہیں کر سکیں گے، تو دوسرا پہلو مالی مشکلات کا ہمارے سامنے آتا ہے۔ کئی مدرسے چندوں پر چلتے ہیں؛ آخر یہ چندے کب تک ہم حاصل کرتے رہیں گے۔ لوگوں پر بار پڑتا ہے۔ اگر کانونٹ قسم کے اسکول ہم قائم کر دیں اور ہمارے یہاں جو اوقاف ہیں، ان کا روپیہ ہم اس طرف لگا دیں ——— بہت سے مسلمانوں کے اوقاف ہیں۔ ایک نظام بنایا جائے اور کانونٹ بالکل اسی طرح ہم جاری کریں اور چلائیں تو مجھے

یقین ہے کہ اور اسکولوں کے بچّے بھی، دوسری قوموں کے بچے ___ آپ کوشش کیجئے۔ گورنمنٹ اسکول میں بچے نہیں جاتے، سینٹ کولمبس میں، سینٹ زیورس میں "کانونٹ آف جیس اینڈ میری" میں جاتے ہیں؛ کیا وجہ ہے آخر۔ انھوں نے اپنا نصاب تعلیم اتنا اونچا کر لیا ہے، ان کے یہاں کے جو فارغ التحصیل ہوتے ہیں، وہ سوسائٹی میں اتنے کامیاب ہوتے ہیں ___ آپ ان بچوں سے باتیں کیجئے، وہ بڑے ذہین معلوم ہوتے ہیں، تمام معلومات انھیں حاصل ہوتی ہیں۔ ہمارے اسکولوں کے بچے جو پڑھ کر نکلتے ہیں تو وہ معلومات کے لحاظ سے، تو سوسائٹی میں گویا بالکل صفر ہوتے ہیں۔

عبدالخالق نقوی

ترمذی صاحب نے جو ارشاد فرمایا چھوٹے بچوں کی تعلیم کا انتظام میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی بہت اہم اور ضروری پہلو ہے۔ اس لیے کہ اگر ہمارے بچے اچھی تربیت نہیں پائیں گے تو وہ آئندہ چل کر بھی اچھے شہری نہیں بن سکتے، اچھا مسلمان بننا تو بہت بڑی بات ہوتی ہے؛ کانونٹ میں غیر علیسائی بھی اپنے بچوں کو بھیجنا پسند کرتے ہیں، یہ صحیح ہے، اس لیے کہ وہاں سے بچے نکل کر گالیاں نہیں بکتے، بیہودگیاں نہیں کرتے، بدتمیزی نہیں کرتے۔ لیکن ہم اپنے بچوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ ___ مثلاً میں جس محلّہ میں رہتا ہوں، وہاں ایک اسکول ہے، منظر الاسلام اسکول؛ میں سمجھتا ہوں بچہ کو اگر غارت کرنا ہو اور اس کی زندگی برباد کرنا ہو تو وہاں بھیج دیجئے۔ تو یہ بہت اہم پہلو ہے۔ اور کچھ عجیب بدقسمتی رہی ہے ہم لوگوں کے ساتھ کہ: ہمارے یہاں مثلاً علی گڈھ کی درسگاہ ہے، دیوبند ہے اور جامعہ ملیہ ہے، نمائندہ درسگاہیں ہیں، عرض کر رہا ہوں؛ میں معذرت کے ساتھ ایک صاحب کا ایک مقولہ یہاں پیش کرنا چاہتا تھا کہ جسکو دین سے غافل کرنا ہو علیگڈھ بھیجدو، جسکو دنیا سے غافل کرنا ہو تو دیوبند بھیجدو، جسکو دین اور دنیا دونوں سے غارت کرنا ہو اسے جامعہ ملیہ بھیجدو۔ تو میرے خیال کے مطابق اس وقت یہ ہمارا جو سمینار ہو رہا ہے، بہت اہم ضرورت کو پورا کر رہا ہے۔ اور اس وقت

ہمارا سب سے اہم مسئلہ ہماری تعلیم کا مسئلہ ہے؛ اور تعلیم کے مسئلہ کے ساتھ دینی تعلیم بھی اس کے اندر شامل ہے جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے، دینی تعلیم ضروری چیز ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگ ایجوکیشن کے اپنے اس مسئلہ کو حل کر سکے تو غالباً ہماری زندگی کے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ آج سب سے بڑی اہمیت اسی مسئلہ کو حاصل ہے کہ ہم تعلیم یافتہ نہیں ہیں، ہمارے بچے تعلیم یافتہ نہیں۔

میں جس محلہ میں رہتا ہوں، وہاں میں نے یہ سنا ہے لوگوں کو کہتے ہوئے کہ صاحب! یہ لوگ تو ہیں پردیسی، اس لیے ان کے بچے پڑھتے ہیں، ہم لوگ ہیں دلی والے، ہمیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ خدا نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ دہلی جو تہذیب اسلامی کا ایک بڑا مرکز رہا ہے، یہاں ہم لوگ فخر کرتے ہیں، زوال و اضمحلال کی یہ صورت پیدا ہو چکی ہے کہ ماں باپ ایسی باتیں کرتے ہیں، بچوں کو ایسی تعلیم دیتے ہیں کہ وہ کبھی مہذب اور مفید شہری نہیں بن سکتے۔ اصل میں تو انھیں سب سے زیادہ اخلاقی تعلیم کی ضرورت ہے۔

ہمیں تاریخ سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ جب کبھی لوگوں نے اپنے آپ کو تیار نہیں کیا تو تبدیلیاں آئیں تو وہ RESIST کر سکے نہ مقابلہ ہی کر سکے، اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ابھی سے تیاری شروع کر دیں اور اپنے لوگوں کو بتلائیں کہ بھائی جو تبدیلی آرہی ہے کس قسم کی ہے، اور ہم جس چیز کے اوپر قائم ہیں یہ کیا ہے۔

جدید نصاب تعلیم کے سلسلہ میں میں سمجھتا ہوں کہ جس طریقے سے ہماری یونیورسٹیوں میں تخصص کے علاوہ ریسرچ کا بھی انتظام ہے تو ہماری دینی درسگاہیں کیوں محروم رہیں۔ اس لیے وہاں بھی اس کا انتظام ہونا چاہیے کہ وہاں سے لوگ ریسرچ کریں، اور بحث و تدقیق سے کام لیں، کتابیں ایڈٹ کریں، نئی کتابیں لکھی جائیں، سب ریسرچ کا کام جو ہے وہاں پر ہونا چاہیے۔ اور اگر اس طریقے سے ریسرچ کا کام شروع کریں گے تو دوسرے لوگوں کے لیے بہت کچھ ملے گا، ان کی ہمت بڑھے گی کام کرنے کی۔

ایک چیز یہ ہے کہ ہمارے یہاں کا ایک فیشن یہ رہا ہے کہ ہماری

درس گاہوں میں منطق و فلسفہ کی جو تعلیم دی جاتی رہی، ان کی ہمیشہ ہم تطبیق دیتے رہے کہ دیکھو قرآن کے اندر یہ ہے" اور فلسفہ یہ ہے"۔ تو ہم نے فلسفہ کو قرآن کے مطابق، یا قرآن کی تعلیم کو فلسفہ کے مطابق کرنے کی کوشش کی۔ یہ فلسفہ اور سائنس جو کچھ ہے، انسانی معلومات کے اوپر اس کی بنیاد ہے، انسانی معلومات ہمیشہ بدلتی رہی ہیں اور آئندہ بھی بدلتی رہیں گی۔ جس نقطہ کے اوپر جس مقام کے اوپر ہم ہیں، اب سے دو سو برس کے بعد آنے والے لوگ ہمیں سمجھیں گے کہ ہمارے بزرگ جو تھے وہ بہت جاہل تھے، بہت ہی تاریک خیال تھے۔ تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس بات کی بھی کوشش کی جائے کہ کبھی ان دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل کبھی نہ لایا جائے۔ قرآن کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ ہم کو کوئی مؤرخ بنادے، یا سائنٹسٹ بنادے، یا ڈاکٹر بنادے یا انجنیئر بنادے۔ قرآن کا مقصد تو صرف یہی ہے کہ وہ ایک شریف اور مہذب انسان بنائے، اور ہم کو اس سوسائٹی کا ایک مفید اور ایک صالح رکن بنادے۔

میں سمجھتا ہوں، اگر ان چیزوں کی روشنی میں ہم غور کریں گے تو ہم کو اپنے نصاب کے مرتب کرنے میں اور اس کا خاکہ تیار کرنے میں شاید زیادہ مدد ملے گی۔

عبداللطیف اعظمی[1]

اس لطیفہ کا ذکر ہمارے یہاں جامعہ میں بھی ہوتا ہے، یہ اس کی علامت ہے کہ ہم تبدیلی کے خلاف ہیں۔ ہندستان کے عربی مدارس میں اگر کوئی ہے تو وہ ہے مدرستہ الاصلاح یہاں ابتدائی تعلیم کے جب میں ندوہ میں گیا تو یہ

دوسرا قدم ہے جہاں مولانا شبلی کی کوششوں سے اصلاح کا کام ہوا ہے۔ تو یہ جو آپ نے بات سنائی (مولانا نانوتوی نے) کہ جسے دین حاصل کرنا ہو دیوبند جائے اور جسے دنیا ـــــ یہ سب سے پہلے میں نے ندوہ میں سنی۔ چونکہ ندوہ میں یہ بھی کہ دین حاصل کرنا ہو تو دیوبند جاؤ۔ یہاں تو نہ دین ملتا ہے نہ دنیا ملتی

---

[1] اردو کے معروف مصنف؛ جامعہ ملیہ سے وابستہ

ہے۔ یہ میں پہلے ندوہ میں سن چکا تھا اور وہاں یہ بھی یہ کشمکش بہت تھی، کہ ہمارے ہاں تعلیم کا مقصد کیا ہے؛ اور بڑے طنز آمیز جملے قدیم مدارس پر وہاں استعمال کیے جاتے تھے؛ اپنے بارے میں فخریہ انداز اختیار کیا جاتا تھا، اور زیادہ تر تصنیف و تالیف، جو ندوہ کا امتیاز رہا ہے، اس کو بیان کیا جاتا تھا کہ دیکھو دیوبند نے ــــ پھر جب میں یہاں آیا ہوں جامعہ میں، تو یہاں یہ بات بہت مشہور تھی۔ ابھی چند روز کی بات ہے ہمارے یہاں میلہ کے موقع پر ایک مباحثہ تھا کہ جامعہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی یا نہیں؟ تو اس میں ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے یہ مقولہ بیان کیا تھا۔ تو میں نے اس کا جو جواب دیا وہیں ڈبیٹ میں کہ محرومی کا جو احساس بیان کیا جاتا ہے تو اس زمانے میں جب میں جامعہ میں آیا تھا یہ واقعہ ہے کہ مقصد ہمارا کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہے؛ نہ بظاہر وہاں دین تھا نہ دنیا تھی۔ تو ہم لوگ اس پر بہت بحث کیا کرتے تھے۔ میں نے کہا تھا کہ واقعی مستقبل اس وقت اتنا تاریک نظر آتا تھا کہ آدمی سمجھتا تھا کہ نہ یہاں دین ہے نہ دنیا ہے۔ مجیب صاحب نے اس کا بہت فلسفیانہ جواب دیا۔ انھوں نے کہا یہ تھا کہ؛ اصل کامیابی اسے ہوتی ہے، جسے محرومی کا احساس ہو؛ اگر ایک شخص یہ سمجھتا ہے کہ مجھے دنیا حاصل ہوگئی ہے تو پھر کوئی مزید کوشش نہیں کرے گا؛ جس کو احساس ہو گیا کہ مجھے دین اور دنیا دونوں حاصل ہو گئے، اسی پہ قانع ہو جاتا ہے؛ ہم خوش ہیں کہ ہمیں محرومی کا احساس ہے، اور ہم میں رہا ہے، اسی لیے ہم نے کوشش کی نئی نئی راہیں پیدا کیں، اور اب بھی محرومی کا احساس ہے، اور کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اصلاح نصاب کے سلسلے میں جتنی باتیں کہی ہیں، وہ سب میں نے پڑھا ہے اور دیکھا ہے، اور اب جو کوشش ہو رہی ہے، میں دونوں میں بہت بڑا فرق محسوس کرتا ہوں۔ اس زمانے میں شبلی بھی جو کوشش کرنا چاہتے تھے، یا مدرسۃ الاصلاح میں جو کوشش ہوئی تھی، کچھ کچھ کتابیں کم کر کے، جس سے نصاب ہلکا ہو جائے اور طالب علم پر زیادہ بار نہ پڑے۔ لیکن اب زمانہ ہی نہیں بدلا ہے بلکہ ہندستان کے مخصوص حالات

بدلے ہیں۔ زمانہ بہت بڑھ گیا ہے۔ ہم ان پرانی کتابوں میں پڑے رہیں گے تو ہم اس دور میں کسی کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔ بلکہ میں یہ محسوس کرتا ہوں ہندستان میں جو سیاسی تقسیم ہوئی ہے —— ہمارا سماج کدھر جارہا ہے، عربی مدارس میں اگر ایسے ہی لوگ پیدا ہوئے جن کا مستقبل کوئی نہیں —— ایک زمانے میں لوگ کہتے تھے کہ کہیں اور جگہ نہیں ملے گی تو کہیں پیش امامی تو کم ازکم مل ہی جائے گی، لیکن وہ میدان بھی بہت محدود ہوگیا ہے، تعلیمی کام بھی محدود ہوگیا ہے۔ اور معاشی میدان میں اس قدر کشمکش ہے، اس قدر مقابلہ ہے کہ ہمارے اچھے انگریزی خواں مسلمان تو اس میں مقابلہ نہیں کرسکتے، عربی مدارس کے لوگ کیا کریں گے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ بہت بنیادی طور پر ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم تعلیم کا کیا مقصد سامنے رکھیں۔ ایک تو بہت ہی واضح ہے، مذہب اسلام کی تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ لیکن کیا مذہب اسلام کی تعلیم صرف عربی ہی پڑھا دی جاسکتی ہے۔ عربی کی تعلیم میں جب آپ بڑھاتے ہیں تو پھر واقعہ یہ ہے کہ صرف و نحو اور دوسرے علوم میں اتنا وقت صرف ہوجاتا ہے کہ اس کے ساتھ جدید علوم کا جو لوگ اضافہ کرتے ہیں، میں ندوہ میں پڑھ چکا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ انھیں جدید علوم قطعی نہیں آتے؛ ٹھیک اسی طرح سے جس طرح سے علی گڑھ یونی ورسٹی یا جامعہ ملیہ میں دینیات نہیں آتی، عربی نہیں آتی؛ دونوں! یہاں پر محض عوام کو دکھلانے کے لیے یا اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے عربی علوم اور دینیات کا اضافہ کیا گیا ہے، وہاں جدید علوم کا؛ نہ انھیں جدید علوم ملتے ہیں نہ یہاں دینیات ملتی ہے، تو ہمیں بہت ہی بنیادی طور سوچنا ہے کہ دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لے کے چلنا ہے۔ پھر، ممکن ہے کہ ہندستان میں آئندہ ترقی کرتے ہوئے، ایسا موقع آئے پر محض تعلیم حاصل کیے ہوئے... آدمی کو ملازمت مل جایا کرے، یہ نہ ہو کہ گورنمنٹ کے منظور شدہ ادارے کا ہو، یونیورسٹی یا کالج ہی کا تعلیم یافتہ ہو تو اسی کو ملازمت ملے۔ جس طرح حالات روبہ اصلاح ہیں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جگہ تعلیم یافتہ شخص کو ملے؛ تو تعلیم یافتہ شخص کیا اسی کو کہیں گے جو معاشیات سے ناواقف

ہو، تاریخ سے ناواقف ہو؟ جتنے علوم ہیں، سب سے ناواقف ہو تو کیا اسے تعلیم یافتہ کے شمار میں وہ لے آئیں گے؟ میں سمجھتا ہوں کہیں بھی اس کا داخلہ بھی نہیں ہو سکے گا۔ جامعہ ملیہ نے ایک تجربہ کیا تھا، اس تجربہ میں بہت زیادہ ناکامی ہوئی ہے اور وہ تقریباً ختم ہو گیا؛ تجربہ بہت شروع سے یہ تھا کہ عربی مدارس کے پڑھے ہوئے لوگوں کو درجۂ خاص میں داخل کر کے کالج کی تعلیم دلا دیتے تھے، اور بی اے ہو جاتا تھا، پھر اس کے لیے ایم۔ اے کے اور آگے کے سب دروازے کھل جاتے تھے۔ لیکن عربی مدارس کے لوگ جب آتے ہیں تو، ایک تو عمر زیادہ ہوتی ہے؛ پھر یہ جدید علوم سے بہت ہی ناواقف ہوتے

ہیں؛ اور ایک تیسرا فیکٹر یہ ہوتا ہے کہ ایسے طبقہ سے آتے ہیں کہ جب تک انھیں کافی وظیفہ نہ ملے وہ چل نہیں سکتے۔ اب جب سے گورنمنٹ کی امداد پر ہمارا انحصار رہ گیا ہے، ہمارا اور کوئی فنڈ نہیں ہے، وظائف کا انتظام نہیں ہے تو ہم ان کو داخل نہیں کر پاتے۔ تو، جو طبقہ ہے جو غریب ہے، جو کہیں تعلیم حاصل نہیں کر پاتا، وہ عربی مدارس میں چلا جاتا ہے، اور بعد میں ٹھوکریں کھاتا ہے۔ اس وقت چاہے کتنے ہی جوش میں وہ کہے کہ مذہب اگر ہے تو سب کچھ ہے، لیکن بعد میں وہ پریشانیاں ہوتی ہیں کہ وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ تعلیم کا مقصد ہمارا یہ قرار پانا چاہیے کہ ایک اچھا مسلمان بنائیں گے؛ دین اسلام سے واقف کریں گے؛ اس کے ساتھ دنیاوی علوم جتنے ہیں، ان سے بھی ہم انھیں بہرہ ور کریں گے، تاکہ اس مقابلہ کی دنیا میں وہ مسلمانوں کے سماج کو اونچا اُٹھا سکیں، اور یہ جو کشمکش پیدا ہے، جس میں ہم بہت پیچھے جا رہے ہیں، اس میں ہم کچھ آگے بڑھ سکیں۔ یہ مقصد نہیں ہو گا تو ہم کچھ کامیاب نہیں ہو سکتے۔

عبد الحلیم ندوی[1]

— عربی مدارس کچھ مقاصد لیکر قائم ہوئے تھے

---

[1] پہلے آل انڈیا ریڈیو، اب جامعہ سے وابستہ جدید عربی کے ایک ممتاز عالم

اب نظام و نصاب میں آپ جو اصلاح کرنا چاہتے ہیں، اس کا حل یہی ہے کہ آپ ایسے ادارے قائم کر کے دکھایئے۔ ندوہ یا دیوبند میں تو یہ ناممکن ہے، اگرچہ ندوہ کی بنیاد عصرِ حاضر کے تقاضوں پر ہے، مگر وہ تقاضے جنھیں وہ سمجھنا چاہتے ہیں۔ آپ کے پاس زور بھی تو نہیں۔ پیسے وہ آپ سے لیتے نہیں۔ اُن کا اپنا ایک نظریہ ہے جس پر سارا تعلیمی بھی قائم ہے۔

تو بجائے ان عربی مدارس میں اصلاح لانے کے جو ممکن بھی نہیں، آپ کی یہ جو یونیورسٹیاں ہیں، جامعہ ملیہ ہے، علیگڈھ ہے، یہ کیوں نہیں تبدیلیاں لاتیں ایسی کہ ان مدرسوں کے لوگ یہاں آ کر عصرِ حاضر کے تقاضے پورے کریں۔

عربی مدارس کے یہ طلبا اکثر تو دینیات کی طرف جائیں گے، کچھ ایسے ہونگے جن کو عربی آتی ہو گی۔ اس وقت ہندستان کو عربی کی ضرورت ہے۔ موجودہ یونیورسٹیاں کم سے کم یہ تو کر سکتی ہیں کہ جن کا رجحان ایسا ہو انھیں عربی اور اسلامک اسٹڈیز میں داخل کریں۔ قاعدے ایسے بنائے جائیں کہ وہ طلبا ادھر آ سکیں۔ اس طرح ہم ایک صاف ستھرا عالم پیدا کر سکیں گے۔

کچھ ایسی ہی بات ان عربی مدارس میں بھی کی جا سکتی ہے کہ موجودہ عربی زبان ہندستان کے لوگ سیکھ سکیں۔ اس کے لیے انگریزی کا مساوی نصاب ضروری ہو گا کہ اس زمانے میں صرف عربی سے کام نہیں چلتا تو دونوں کا ایک معیار ہو کہ دونوں زبانوں سے دونوں زبانوں میں ترجمہ کر سکیں۔

اور مدرسے یہ کام نہ کر سکیں تو یونیورسٹیوں کو تو کرنا ہی چاہیے، اس طرح معاش کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

قاضی سجّاد حسین[۵]

جب تک کوئی مقصد نہ ہو جس کی طرف لوگ لپکیں، اُس وقت تک کوئی نصاب کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ایک وقت تھا جب دین مقصدِ اعلیٰ قرار دیا گیا تھا تو اسی نصاب کو پڑھنے سے اچھے اچھے لوگ پیدا ہوئے۔

۵ نائب متولی، ہمدرد، دہلی؛ فارسی زبان میں اعلیٰ ترین سرکاری اعزاز سے متمتع۔

رہا اصلاحوں کے نفاذ کا مسئلہ تو ایک مثالی درسگاہ بنا دیجئے، اور اس میں اپنا اصلاحی نصاب رائج کر دیجئے تو خود مثال بن جائے گی۔ بنجر زمین میں آپ صندل لگا کے گلاب کی توقع رکھیں یہ کہاں تک مناسب ہو گا۔ شمس بازغہ پر بحث کرنا، صدرا اور مولویوں پر اعتراض کرنا، اور کہنا کہ وہ بات نہیں رہی، تو راہیں کھولیئے پھر دیکھئے وہی بات پیدا ہو جائے گی۔

ان مدرسوں کی جو کیفیت ہے ظاہر ہے وہ۔ زکوٰۃ کے پیسوں پر چلنے والے مدرسے، جہاں نچلے طبقے کے غریب لوگ پڑھنے آتے ہیں، غزالی کیسے پیدا کریں گے۔ اگر آپ اس کی طرف توجہ کریں تو اعلیٰ صلاحیتیں، اور اعلیٰ کمال بھی پیدا ہونا ممکن نہیں۔ کوئی ایک مدرسہ اس کے لیے مقرر کر کے ایک مثالی درسگاہ کے طور سے چلائی جائے۔ ایک معقول نصاب اس کے لیے تیار ہو، پھر یہ مثال بن سکتا ہے پورے ہندستان کے لیے۔

نور الدین احمد[1]

تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ معاش یا کچھ اور؟ میرے خیال میں معاش کبھی تعلیم کا مقصد نہیں رہا، یہ میں ایک تاریخی بات پیش کر رہا ہوں۔ آپ کے جتنے کروڑ پتی لوگ ہیں، یہ وہ ہیں جنھوں نے تعلیم کم پائی ہے۔ تعلیم سے کچھ قدریں پیدا ہو جاتی ہیں، اور پھر آدمی کمائی کے جائز ناجائز ہر طریقے استعمال کرے، یہ اُس سے نہیں ہوتا، تو معاش تعلیم کا مقصد نہیں۔

پھر ہمارے جتنے بڑے بڑے عالم تھے، وہ کچھ ہنر بھی جانتے ہوئے ہوتے تھے۔ وہ معاش کے لیے ہنر حاصل کرتے تھے۔ جولاہے، خیاط وغیرہ۔ معاش ایک بہت ذلیل اور ادنیٰ چیز سمجھی جاتی تھی، یہ ہمیں اب بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ اور مسئلہ مدرسوں کی ڈگریاں RECOGNISE کرانے کا نہیں، اس سے کام نہیں چلے گا، اصل مسئلہ تو انسان کے ذہن کی نشوونما ہے۔ جتنے مضامین پڑھائے جاتے تھے ریاضی، فلسفہ، منطق، تو اس لیے نہیں کہ طب پڑھ کر طبابت کی جائے گی، بلکہ صرف

---

[1] سابق میئر دہلی، ہندوستان ۱۹۲۵ء، نفیس ترین نمونہ، اسلامی مسائل پر مستقل فکر کرنے والے

اس لیے کہ ہر پڑھا لکھا طب۔ سے واقف ہوتا تھا --- تو دماغ کی نشوونما اصل مقصد ہے۔ اس کے لیے نصاب ایسا بنایئے کہ جس سے یہ مقصد پورا ہوتا ہو۔ تعلیم ایک راستہ ہے جس سے سوچنے کی عادت ہوتی ہے۔

تعلیم کا مطلب ہے تہذیب۔ تو ہمیں اصلاح بھی اسی نقطۂ نظر سے کرنا چاہیئے، اور یہ جاہلیت جو طاری ہو گئی ہے، خاص درس نظامی کے طلبا میں بھی میں نے ایسے بکثرت دیکھے ہیں۔ تو اب یہ دیکھئے کہ ان کی یہ حالت ایسی کیوں ہے؟

دوسرے یہ کہ آپ کوئی نصاب بنانے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو اُسے نافذ کیسے کریں گے، قبول کیسے کرائیں گے۔ اس میں ایسی کیا بات ہوگی کہ لوگ آپ کی طرف لپک کے آئیں۔ رد بیر کی کشش ہو، دماغی نشوونما کا پہلو ہو، یا پھر دین، اور یہ غور کیا جائے کہ IMPLEMENTATION کیسے ہو۔ جامعہ ملیہ جیسا کہ لوگوں کا خیال ہے اسی JMPLEMNTION کے لیے قائم ہوئی۔ ندوہ بھی۔ اب آپ اس پر غور کیجئے۔ میرے خیال میں آپ ایسے کر سکتے ہیں کہ COUNTRY WIDE تبلیغ کیجئے۔ ایسے آدمی پیدا کیجئے کہ مسلمان بچوں، بلکہ ساری ہندستان کے بچوں کو تعلیم کے اپنے رستوں پر چلا سکیں، مسلمان جو راستے لیے کرتے ہیں تو صرف ان کے لیے نہیں ہوتا ہے، بلکہ ہر فرد بشر کے لیے۔ ہم کو اپنے کو ترقی دے مثال پیدا کرنا دوسروں کے لیے۔

اور اصل مسئلہ تو سامنے کا ہے۔

ایسا نظام بنائیں کہ قصائیوں کے بچے، دماغ جن کے کند ہیں، دن بھر گالیں اور شام کو بائیسکوپ کی کھڑکیوں پر لائن میں لگ جانا جن کا روز کا دستور ہے ——— اِدھر توجہ کریں۔

تو تعلیم کا مقصد معاش نہیں بلکہ اصلاح ہے۔

سید اوصاف علیؒ

غالباً تمام حضرات اس بات پر متفق معلوم ہوتے ہیں کہ ہمارے دینی عربی مدارس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کو سمجھا جائے اور سمجھایا جائے، یا بالفاظ دیگر استحکام اسلام۔ اس سے انکار نہیں ہے۔ لیکن ایک بات کی طرف ڈاکٹر عبد العلیم نے اشارہ کیا تھا اور وہ یہ کہ کیا ہندستان میں کثرت سے پھیلے ہوئے تمام عربی اور دینی مدارس کو وہی درجہ دیا جائے جو ہم دیوبند کو دیتے ہیں، جو ندوۃ العلماء کو دیتے ہیں۔ جو مظاہر العلوم کو دیتے ہیں؟ اسی سلسلہ میں میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں کچھ ادارے ہندستان میں مخصوص کر دینے چاہئیں۔ دس ہوں، پندرہ ہوں، بیس ہوں، پچیس ہوں، جہاں خالص دینی تعلیم دی جائے، اس نقطۂ نظر سے کہ وہاں سے اچھے اچھے عالم نکلیں، اور وہ اسلام کی تبلیغ واشاعت میں مصروف ہوں۔ باقی ہزار یہ ہزاروں مدارس جہاں ہمارے بچے جاتے ہیں، اور جہاں نہ انھیں عربی آتی ہے، عربی ٹھیک سے پڑھ کے نکلتے ہیں، نہ انھیں تحریر پہ قدرت ہوتی ہے، نہ تقریر پہ، نہ کسی کام کے ہوتے ہیں؛ ان تمام مدارس میں سیکولر ایجوکیشن یعنی دنیوی تعلیم دی جائے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ترمذی صاحب نے فرمایا تھا کہ آج بہت سے مشنری کالج اور اسکول ہیں ہندستان میں، وہاں بائبل پڑھائی جاتی ہے۔ خود میں نے ایک کرسچین کالج میں تعلیم حاصل کی ہے؛ وہاں ہم لوگوں کو صبح بائبل کا درس دیا جاتا تھا۔ اسی طریقہ سے ہم ان مدارس کو سیکولر اسکولوں میں تبدیل کر دیں جہاں پہ دنیوی تعلیم دی جائے لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک یا دو گھنٹے روز اس کے لیے علیحدہ کر دیے جائیں کہ قرآن وحدیث اور فقہ وغیرہ جو اہم بنیادی چیزیں ہیں ان پر انھیں کتابیں پڑھا دی جائیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ گورنمنٹ سے ہم کو کافی امداد مل سکے گی۔ بعض حضرات نے یہ کہا کہ آخر چندوں پہ مدارس کب تک چلیں گے؛ ان کی مالی حالت نہایت خراب ہے، اور وہاں بچے جس طریقے سے جن حالات میں، تعلیم پا رہے ہیں، اس کا تصور ——— ناقابل بیان ہے۔ وہ بات۔ تو اس میں ہمیں گورنمنٹ سے امداد مل سکتی ہے۔

۱؎ اسسٹنٹ ڈائریکٹر فنی انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، و سکریٹری

اجمل خاں :- گورنمنٹ سے ایڈ مل سکتی ہے ؟ نہیں !

اوصاف علی :- یہ دستور ہند میں صاف لکھا ہوا ہے کہ اگر کوئی اقلیت اس قسم کے مدارس یا کالج قائم کرے جہاں معیار تعلیم دنیوی معیار تعلیم اتنا ہی ہو جتنا گورنمنٹ کے کالجوں اور اسکولوں میں ہے، چاہے وہ اسکول میں علیحدہ سے ایک دو پیریڈ دینیات کے لیے علیحدہ کر دیں، ان کو گورنمنٹ ایڈ دیگی۔

عتیق صدیقی :- مگر دینیات لازمی نہیں کر سکتے۔

علی اکبر ترمذی :- گورنمنٹ ایڈ ضرور دیگی، اگر سیکولر ایجوکیشن ہو۔ لیکن جو دینی تعلیم کا مدرس ہوگا، اس کی تنخواہ ادارے کو دینی ہوگی کیونکہ گورنمنٹ جو ایڈ دیتی ہے تو ۹۰ فیصدی ہوتی ہے۔ دس فیصدی تو ادارے گا ہی۔ بلکہ اس سے فائدہ یہ ہوگا ـــ دیکھیے دلی۔ اے۔ وی۔ اسکول جتنے ہیں، یہاں برولی میں آپ دیکھیے۔ وہاں باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے مذہبی۔ اور وہ باقاعدہ گورنمنٹ سے ایڈ لیتے ہیں؛ لیکن ساتھ ساتھ انھوں نے مذہبی تعلیم کا ایک پیریڈ رکھا ہے۔ مگر اس مذہبی تعلیم کے پیریڈ کے لیے جو تنخواہ دی جاتی ہے، وہ گورنمنٹ ایڈ سے نہیں، بلکہ اس ادارے کی جانب سے دی جاتی ہے۔ تو آخر ہم اس سے کیوں فائدہ نہ اٹھائیں، جب ہمارے مدارس بری حالت میں ہیں، روپیہ نہیں، چندہ اکٹھا کیا جا رہا ہے! گورنمنٹ جو ایڈ دیگی ہم اس کو سکولر لائن پر چلائیں گے اس کو، تو میں سمجھتا ہوں زیادہ مناسب ہوگا۔

اور دوسری چیز میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ ابھی نقوی صاحب نے فرمایا کہ آزاد ہندستان میں COMPETITION بہت بڑھ چکا ہے۔ مگر یہ صرف ہمارے ہی بچوں کے لیے نہیں بلکہ اور جو MINORITIES ہیں ان کے سامنے یہ مسئلہ آتا ہے کہ تعلیم پانے کے بعد بھی ملازمتیں نہیں ملتیں؛ ملازمت کیا تجارت میں بھی آپ COMPETITION نہیں کر سکتے۔ تو آخر: ہمیں SPECIALIZATION کرنا چاہیے۔ ایسے FIELDS میں جو SCACITY FIELDS کہلاتے ہیں جہاں پہ دوسرے لوگ کم جاتے ہیں، اس فیلڈ کی طرف ہمیں توجہ کرنی چاہیئے تاکہ ہمارے بچے اس طرف

بڑھیں اور SPECIALIZE کر کے ان ملازمتوں یا اس تجارت یا اس TECHNOLOGY کے فیلڈ میں بڑھ سکیں۔ اگر اس طرف ہم نے توجہ نہیں کی، اور صرف GRADUATES نکالتے رہے تو مسئلہ حل نہیں ہوگا بلکہ ہمیں یہ سوچنا ہے MINORITY کی حیثیت کہ ہمارے لیے کونسے ایسے SCARCITY FIELDS ہیں! سیلانی اور ڈیمانڈ کا سوال

ہے۔ خسرو جو دہلی یونی ورسٹی میں پروفیسر ہیں انھوں نے ECONOMICS OF COMMUNALISM کے نام سے آرٹیکل لکھے تھے جو بہت دلچسپ تھے۔ بڑا دلچسپ تجزیہ کیا تھا انھوں نے کہ آخر یہ فرقہ پرستی اگر MINORITY COMMUNITY کرتی ہے تو اس کے لیے زیادہ مضر ثابت ہوتی ہے بہ نسبت MAJORITY COMMUNITY کے۔ انھوں نے باقاعدہ STATISTICS سے یہ ثابت کیا تھا کہ اگر اقلیتیں فرقہ واری کی طرف جاتی ہیں، تو ان کو زیادہ نقصان ہوتا ہے، کیونکہ اگر دس فیصدی وہ BIAS ہو تو ادھر نوّے فیصدی BIAS ہوجاتا ہے، تو ہمیں اس نقطۂ نظر سے بھی سوچنا ہے، معاشیات کے نقطۂ نظر سے کہ ہمیں کتنا نقصان ہوتا ہے، اگر ہم سوچیں: اگر ہم مدرسے سیکولر لائن پہ چلائیں، جیسے اوصاف صاحب نے فرمایا، اور ساتھ ساتھ ہم مذہبی تعلیم بھی دیں! میں ضروری سمجھتا ہوں کہ مذہبی تعلیم دی جائے بچوں کو۔ مثلاً میرے بچے پبلک اسکول میں پڑھتے ہیں۔ ان کی مذہبی تعلیم کوئی نہیں ہوگی! میں محسوس کرتا ہوں کہ انھیں مذہبی تعلیم دی جائے۔ لیکن دقت یہ ہوتی ہے کہ ان کے پاس وقت نہیں ہے! اتنا بوجھ ہوتا ہے نصاب کا تنا نام سرف ہوتا ہے —— مگر اس کے لیے بہتر حل یہ ہوگا کہ جیسے یورپ میں SUNDAY SCHOOLS ہوتے ہیں اتوار کو کچھ مدرسے لگتے ہیں۔ ان میں ان بچوں کو جن کی دینی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہوتا ان کے لیے انتظام کیا جاتا ہے۔ تو کیوں ہم SUNDAY SCHOOLS جاری نہ کریں؛ اور ایسے نصاب ترتیب دیں جس کی وجہ سے سال بھر میں یا دو سال میں سنڈے کے حساب سے وہ نصاب مکمل ہوجائے۔

عبدالخالق نقوی: بات پھر گویا اپنی جگہ پر رہ جاتی ہے! یہ کچھ موجودہ زمانے

کے تقاضے پورے ہونگے؛ لیکن دینی مدارس جس طریقے سے چل رہے ہیں ان میں ان کا نصاب؛ ان کا نظامِ تعلیم؛ اور اسلام کا استحکام؛ اور جو اس وقت موجودہ ہوائیں چل رہی ہیں مادیت کی، ان کا مقابلہ کرنے کے قابل بنانا؛ یہ تو سب ختم ہو جائے گا؛ اگر ہم صرف یہی رکھیں کہ بھئی اپنے آپ کو، اپنے سکولوں کو، ہم سیکولر سکولوں میں تبدیل کر دیں گے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی قبر خود کھودی، اور اپنے آپ اس کو ختم کر دیا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں۔

محمد اجمل خاں: دیوبند نے اس سے انکار کر دیا۔

سید اوصاف علی: وہ تو میں نے عرض کیا تھا کہ اس قسم کے ادارے جو خالص دینی تعلیم دیں ان کی ایک تعداد متعین ہو جائے۔ بیس پچیس جو مشہور ادارے ہیں، وہ اپنی جگہ پر رہیں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔

علی اکبر ترمذی: دیوبند کو رکھا جائے اور دوسرے بڑے بڑے ادارے ہیں، ہم UTILIZE کرنا چاہتے ہیں۔

زید ابوالحسن فاروقی: ضرورت اس کی ہے وہاں سے قابل افراد بھی پیدا ہوں۔ ان میں ایسی اصلاح ہونی چاہیے کہ اچھے ہونہار طالب علم نکلیں۔

سعید انصاری[۵]

اصلاح کیلئے پہلے بھی بیچ کی راہیں نکالی گئیں۔ ندوۃ اور جامعہ یہ اس کی دو مثالیں ہیں، لیکن یہ کبھی کچھ کامیاب نہیں ہوئیں۔

اصل میں اب تک ہم نے گھوڑے کو گاڑی کے پیچھے لگایا ہے۔ پیوندکاری یا کم و بیش پر قناعت کرنے کے بجائے ہمیں فن تعلیم کی روشنی میں از سرنو غور کرنا چاہیے تھا۔ اب تک وہی کتابوں کا ردوبدل اور معمولی ترمیم و تنسیخ ہوتی رہی ہے۔ جب کہ فن تعلیم یہ کہتا ہے کہ مواد تعلیم کے سلسلہ میں مقاصد کا تعین

۵ پرنسپل جامعہ ٹرینگ کالج؛ ایک عرصہ تک دارالمصنفین سے وابستہ رہ چکے ہیں

ضروری ہے، یعنی یہ کہ طلبا رکن قدروں کو لے کر نکلیں گے۔ کتابی ترمیم کا حصہ ثانوی ہوتا ہے۔ مقدم کو مقدم سمجھنا چاہیے۔ موخرالذکر کو موخر۔ میں تو قدیم و جدید کے فرق کو بھی نہیں لانا چاہتا، یا یہ کہ یہ افضل ہے اور یہ از کار رفتہ وغیرہ۔ مقاصد کی تعیین کے بعد ان کی روشنی میں آپ طے کر سکتے ہیں کہ کتنے علوم عصریہ نصاب میں رہیں کتنے قدیم علوم، اور پھر ان میں کتنے معقولات اور کتنے منقولات۔

پھر ہمارے یہاں تو کتابیں اصل ہو کر رہ گئی۔ بعض کتابیں میں مانتا ہوں کہ لافانی ہوتی ہیں، لیکن ـــــ آپ ان کتابوں کی سفارش کر سکتے ہیں کہ ان سے اس فن میں مدد مل سکتی ہے۔ ویسے استاد کسی بھی کتاب سے اس فن کو سکھا سکتا ہے۔

نظام تعلیم کا جہاں تک تعلق ہے۔ ان سب مدارس کو واقعتہً ایک نظام میں پرونے کی ضرورت ہے۔ خود جدید تعلیم کے سلسلہ میں ایسی بہت سی تنظیمیں ہیں۔ اداروں کے ادغام کا خطرہ پیدا ہوئے بغیر یہ تنظیمیں قائم ہیں۔

ایک مسئلہ اور ہے، کیا پڑھائیں، اس پر تمام زور صرف کیا جاتا ہے اور اس امر کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے کہ متعلم کے علاوہ ایک اور فریق بھی ہے یعنی معلم۔ اس بے زبان مخلوق کو بالکل الگ رکھا جاتا رہا ہے۔

سعید احمد اکبر آبادی

جو کچھ بھی تعلیم کے متعلق کہا جائے، میں جہاں تک سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس کو ایک لفظ کے اندر جمع کیا جا سکتا ہے، اور وہ لفظ وہ ہے جس کو کہ خود علامہ اقبال نے بار بار استعمال کیا اور وہ ہے تکمیل شخصیت۔ علم کا مقصد درحقیقت شخصیت کی تکمیل ہے، یا خودی کی تکمیل یا خودی کو معلوم کرنا، خودی کا یقین پیدا کرنا۔ شخصیت کی جو تکمیل ہوتی ہے وہ اس وقت ہوتی ہے جب کہ شخصیت ان چیزوں سے واقف ہو جن سے واسطہ پڑتا ہے، اور ان چیزوں سے واقفیت کے بعد وہ اپنی نظر میں، فکر میں، عمل میں اور کردار میں وہ اوصاف اور کمالات پیدا کرے جو کہ ان روابط اور علائق کا مقتضا

ہوتی ہیں۔ تو انسانی شخصیت کا رابطہ اور علاقہ ایک طرف تو خدا کے ساتھ ہوتا ہے، دوسری طرف کائنات کے ساتھ ہوتا ہے، اور تیسری طرف خود اپنے نفس کے ساتھ ہوتا ہے۔ تو ایک مکمل شخصیت درحقیقت اسی وقت میں ہو سکتی ہے جب کہ ایک طرف اس کو خدا کی ذات اور صفات کا علم ہو، اور خدا کے ساتھ جو اس کا ربط اور تعلق ہے اس تعلق کا اس کو یقین حاصل ہو۔ جس کو علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ ؎

یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے

تو ایک طرف تو یہ چیز ہے، دوسری طرف کائنات کا علم ہے، وہ اس وقت تک آپ معلوم نہیں کر سکتے، جب تک کہ کائنات کا علم نہ ہو۔ پھر خود آپ کو جب تک اپنے نفس کا علم نہیں ہوگا، معرفت نفس نہیں ہوگی، تو اس وقت تک آپ اپنی شخصیت کی تکمیل علیٰ احسن الوجوہ اور خاطر خواہ طور پر نہیں کر سکتے ہیں، تو قرآن کے نقطۂ نظر سے علم کا جو مقصد ہے، وہ ہے تکمیل شخصیت: یعنی یہ کہ ایک طرف انسان کے اندر اللہ کے ساتھ تعلق کی وجہ سے عبدیت تامہ اور عبدیت کاملہ آئے، دوسری طرف کائنات کا اس کو علم حاصل ہو، وہ کائنات جو اس کے لیے مسخر کی گئی ہے، جس کی غرض و غایت تخلیق انسان کی نفع رسانی اور انسان کی خدمت ہے، اور دوسری طرف پھر معرفت نفس ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ قرآن میں ان تینوں چیزوں کو بڑی تفصیل، اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ خدا نے اپنی صفات کو جگہ جگہ بیان کیا ہے، اور پھر کہا ہے کیا "ءَ اِلٰہٌ مع اللہ" کیا اب بھی تم اللہ کے ساتھ معبود گرو گے، "فبأیِّ آلاءِ ربکما تکذبان" کیا اب بھی تم اللہ کی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟ کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! ایک طرف تو یہ۔ پھر دوسری اس نے کہا: وفی انفسکم افلا تبصرون" کیا تم اپنے نفس کے اندر جھانک کر نہیں دیکھتے؟ پھر اس کے علاوہ انفس و آفاق کے متعلق بھی وہ کہتا ہے، ان تمام چیزوں کو دیکھو، ان تمام مخلوقات کو دیکھو۔ تو اس بناء پر علم کی تحصیل کا جہاں تک تعلق ہے تعلیم قدیم اور تعلیم جدید کا کوئی تصور اسلام کے اندر نہیں ہے، اسلام کے اندر تعلیم کا مقصد تکمیل شخصیت ہے،

مگر تکمیلِ شخصیت کے مدارج اور مراتب ہوتے ہیں، چنانچہ قرآن نے خود کہا ہے:
"وکلٌ یعمل علیٰ شاکلتہٖ" ہر شخص اپنی استعداد اور اپنی وسعت کے مطابق سعی و کوشش کرتا ہے۔ ایک شخص جو ہے اس کے اندر قوتِ نظر کمال کی ہے، تو آپ اس سے توقع کریں کہ وہ مزدور بن جائے اور MANUAL WORK کرے! نہیں! ایک آدمی جو ہے اس کے جسمانی قویٰ بہت عمدہ ہیں، وہ سپاہی بن سکتا ہے، معمار بن سکتا ہے، مزدور بن سکتا ہے! آپ اس سے توقع کریں کہ وہ فلسفی بن جائے، وہ فلسفی نہیں ہو سکتا! پھر اس کے مختلف شعبے ہیں کہ قوتِ نظر جن میں مصروفِ تگ و دو ہوتی ہے، وہ ایک میدان نہیں، بلکہ ہزاروں میدان ہیں۔

وہ میدان طبیعیات کا بھی ہے، اخلاقیات کا بھی، نفسیات کا بھی ہے، حیوانیات کا بھی، نباتیات کا بھی ہے، شریعت کا بھی ہے، طریقت کا بھی ہے اور تمام سب ہیں۔ تو جس طرح آپ اس کو محدود نہیں کر سکتے، اور کسی کے اوپر آپ IMPOSE نہیں کر سکتے۔ یعنی آپ یہ نہیں کہ ہر شخص کے لئے ان تمام کا حاصل کرنا ضروری ہے، ہر شخص کو خدا کی ذات اور صفات کا علم مکمل طور پر حاصل کرنا ضروری ہے ہر شخص کے لیے معرفتِ نفس مکمل طور پر ضروری ہے، یہ آپ نہیں کہہ سکتے؛ کیوں کہ اگر آپ یہ کہیں گے تو "ان اللّٰہ لا یکلف النفس الا وسعہا"، یہ اس کے خلاف ہو جائے گا تو لہٰذا اسلام یا قرآن اس کا تو آپ کو مکلف نہیں کرتا۔ البتہ وہ ایک بات کا مکلف کرتا ہے، اور وہ یہ کہ: ایک طرف تو ہے معرفتِ رب، اور رب کے ساتھ تعلق۔ تو اتنا تعلق تو ہر مسلمان کے لیے وہ لازمی قرار دیتا ہے جو کہ اس کی ایمانی زندگی میں، جتنا کہ اس کے لئے ضروری ہے۔ اسی طرح علوم دنیوی میں وہ اتنا علم ضروری قرار دیتا ہے، ہر مسلمان کے لیے، جس سے کہ وہ دنیا کے اندر اپنی زندگی بسر کر سکے، اپنی معاش حاصل کر سکے:
ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃً وقنا عذاب النار۔

اسلام کا تعلیم کا جو تصور ہے اس کا مقصد... دو لفظوں کے اندر یہ ہے کہ ایسے مسلمان ہوں جو کہ ایک طرف تو علوم دینیہ کے ماہر ہوں، مگر ساتھ میں علوم دنیویہ بھی جانتے ہوں۔ نمبر دو، ایسے ہوں کہ علوم دنیویہ کے ماہر ہوں، مگر ساتھ

میں دین بھی جانتے ہوں۔ چونکہ اسلام دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لے کر چلتا ہے، البتہ کمی بیشی ۔۔۔۔ اگر آپ کے اندر استعداد ہے۔ علم دین میں زیادہ ترقی کرنے کی، تو وہ کہتا ہے آپ عالم بنیے، چونکہ ہمیں علما کی بھی ضرورت ہے۔ مگر ساتھ میں آپ اپنی دنیا کو بھی نہ چھوڑیے، اور دنیا حاصل کرنے کے جو ذرائع ہیں اور علم ہے، ان کو آپ حاصل کیجیے۔ اور اگر وہ دیکھتا ہے کہ ایک شخص کے اندر علم دین سے مناسبت نہیں ہے تو اس کے اوپر وہ لازمی نہیں قرار دیتا کہ نہیں صاحب آپ دیوبند کے مدرسہ کے اندر داخل ہوں ۔۔۔۔ یہ بالکل نہیں۔ لیکن ایک مسلمان کو اسلامی زندگی بسر کرنے کے لیے جتنا علم دین ضروری ہے، وہ ضروری ہے، گویا دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں علم دین کی تحصیل جو ہے اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک ہے فرض عین، ۔۔۔ اور ایک ہے فرض کفایہ۔ نفس دین، اتنا دین جس سے کہ مسلمان کو یہ معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہے اور بحیثیت مسلمان کے اس کو یہ کرنا چاہیے، بس اتنا دین جو ہے وہ تو فرض عین ہے؛ باقی اس کے علاوہ دین کے اندر مہارت اور ترقی، یہ تمام چیزیں جو ہیں اس کے لیے فرض کفایہ کی حیثیت رکھتی ہیں، یعنی وہ یہ چاہتا ہے کہ سوسائٹی کے اندر ایسے لوگ موجود رہنے چاہئیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ سماج کا ہر آدمی اس قسم کا ہو جائے۔ چنانچہ قرآن نے کہا کہ تم میں کچھ ایسے لوگ ہونے چاہئیں کہ یامرون بالمعروف و ینہون عن المنکر۔ اسی کے بالمقابل وہ یہ نہیں کہتا کہ تم میں سے ہر شخص کو انجینیر ہونا چاہیے، ڈاکٹر ہونا چاہیے، سائنٹسٹ ہونا چاہیے۔ بلکہ یہ لوگ بھی ایسے ہی ہونا چاہئیں، جیسے علما ہونے چاہئیں، مگر علما کی شان وہ کہ دنیا سے بھی واقف، اور دوسری طرف وہ لوگ انجینیر، ڈاکٹر دین سے بھی واقف۔ تو اس طرح وہ دین اور دنیا دونوں کو ساتھ لیے چلتا ہے اور اس کے مدارج اور مراتب کرتے ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے یہاں جو ایک خاص قسم کا نظام فکر پیدا ہو گیا ہے، تعلیم جدید اور تعلیم قدیم کے نمائندوں کے ٹکراؤ اور تصادم سے، تو اس سے بڑی بڑی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس غلط فہمی کی میں آپ کو ایک مثال دوں:-

تقسیم ہند سے بہت پہلے کی بات ہے کہ میں نے ایک مرتبہ یہاں میں ہندستان کی اسلامی درسگاہوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ہندستان میں یہ درسگاہیں چار قسم کی ہیں: ایک وہ جو خالص دینی ہیں، یعنی جیسے دیوبند؛ ایک وہ جو خالص دُنیوی ہیں، یعنی جیسے علیگڑھ؛ ایک وہ جو دینی ہیں، مگر دُنیوی، ندوہ، اور ایک وہ جو دُنیوی ہیں، مگر دینی، یعنی جامعہ۔ اس پر مولانا سلیمان ندویؒ نے مولانا بھائی حفظ الرحمٰن صاحبؒ سے ایک سفر میں شکایت کی کہ سعید نے ندوہ کی بڑی سخت توہین کی ہے۔ تو میں نے کہا وہ "مگر" کا مطلب غالباً یہ سمجھے جو عربی میں لکن کے معنی ہوتے ہیں، استدراک کے لیے، کہ میں نے دینی کہا اور اس کے بعد رجوع کر لیا، یعنی دینی نہیں دُنیوی! حالاں کہ مطلب اس کا یہ تھا کہ دینی ہے، مگر ساتھ میں دنیوی علوم و فنون کو بھی اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ اسی طرح میں نے جامعہ کے متعلق کہا کہ جامعہ جو ہے وہ دُنیوی درسگاہ ہے مگر دینی، یعنی دینی علوم و فنون کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ تو آپ دیکھیں تو یہ چار دن ہماری درسگاہیں جو ہیں ---- یوں تو اسلام کے نقطۂ نظر سے اگر آپ پوچھیں کہ آئیڈیل درسگاہ کیا ہے، تو اسے آپ چھوڑ دیجیے کہ اس وقت دیوبند کیا ہے اور علی گڑھ کیا ہے۔ لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ خالص دینی ہے، یہ خالص دُنیوی ہے، اور وہ ایسے ہیں، یہ مان لیں آپ کہ یہی ہے واقعی ---- اسلام کے نقطۂ نظر سے، اگر آپ دیکھیں گے تو آپ کو یہ کہنا پڑے گا کہ صحیح ISLAMIC IDEALOGY کے مطابق جو درسگاہیں ہیں وہ:

ایک ندوہ ہے اور ایک جامعہ۔

(محمد اجمل خاںؒ[1]: جزاک اللہ!)

اس کی وجہ کیا ہے۔ وہ وجہ یہی ہے اصل میں کہ وہ کسی طرح بھی دین کو دنیا سے منقطع نہیں کرتا۔ تو چونکہ مقصد تکمیلِ شخصیت ہے، اور تکمیلِ شخصیت کے مختلف مدارج ہوتے ہیں، مختلف مراتب اور مظاہر ہوتے ہیں، مختلف ذرائع و وسائل ہوتے ہیں۔ اس بنا پر جس طرح سے ایک مسلمان عالم اپنی شخصیت کو ایک خاص راہ پر چل کر تکمیل کرتا ہے اسی طرح ایک مسلمان سائنٹسٹ، ایک مسلمان انجنیر ایک مسلمان ڈاکٹر بھی تکمیلِ شخصیت کرتا ہے، اگر اس نے وہی راستہ اختیار کر رکھا ہے

۱ ہندستان کے ممتاز اور جلیل مفکر، جو حال ہی میں ہم سے جدا ہو کر مولانا آزاد سے جا ملے

جو اسلام نے تعلیم کے لیے مقرر کیا ہے۔ کیوں؟ اس واسطے کہ اسلام جو سماج پیدا کرتا ہے، وہ یک جہتی سماج نہیں ہے، یک فنی نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر ہمہ جہتی ہے، اس کے اندر تو ہر قسم کے آدمیوں کی ضرورت ہے۔

دوسرا مسئلہ معاش اور معاد کا ہے، جس پر یہاں کافی گفتگو ہوئی۔ مولانا انور شاہ صاحبؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ علم کو لوگ تین اغراض سے حاصل کرتے ہیں: ایک وہ جو علم کو کسب زر کے لیے حاصل کرتے ہیں، اور ایک وہ جو علم کو حاصل کرتے ہیں دین کے لیے۔ تو سب سے زیادہ اخص الناس جو ہیں وہ ہیں جو علم کو حاصل کرتے ہیں زر کے لیے، یعنی واحد مقصد ان کا کسب زر ہی ہوتا ہے حظِ نفس اور اپنے آپ کو فائدہ پہنچانا۔ تو یہ چیز ظاہر ہے کہ اس کے خلاف ہے۔ اس واسطے کہ قرآن نے کہا ہے:

"وفی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم"

آپ اگر مال بھی کما رہے ہیں، تجارت بھی کر رہے ہیں، یا تنخواہ لے رہے ہیں صرف اس لیے کہ اپنے بال بچوں کے واسطے عیش و آرام کا انتظام کریں، اور باقی آپ کا شرفہ اور آپ کی امت کتنی ہی غریب ہو، اس کی کوئی پروا نہیں، تو یہ اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ لیکن اگر آپ دنیا کما رہے ہیں اور اس میں آپ سمجھتے ہیں کہ سائل کا اور محروم کا بھی حق ہے تو وہی چیز عین اسلام کے مطابق ہو جاتی ہے۔ تو اس بنا پر فقط کسب زر اور حصول دنیا کے لیے جو لوگ علم حاصل کر رہے ہیں، وہ بالکل ایسا ہے

جیسا کہ ایک بہت اعلیٰ درجہ کے دوشالہ آپ استعمال کریں جوتیوں کو صاف کرنے کے واسطے، جب کہ اس کا ایک بہت اعلیٰ اور اونچا مقصد ہے۔

نمبر ۲ کے اوپر وہ ہیں جو علم کو علم کے لیے حاصل کرتے ہیں، وہ بھی وہ ہیں جو: مِمَّا یُتَحَمَّل، یعنی ان کو برداشت کیا جا سکتا ہے۔ سب سے اونچے وہ لوگ ہیں جو علم کو حاصل کرتے ہیں دین کے لیے۔ مگر دین کا CONCEPTION فقط یہ نہیں ہے کہ نماز روزہ بتلا دیں؛ پوری زندگی جو ہے وہ دین ہے۔ زندگی کی ہر حرکت، ہر سکون، ہر سانس، ہر جنبش، اٹھنا بیٹھنا، آپس کے ازدواجی تعلقات، عائلی تعلقات، خاندانی تعلقات، قومی تعلقات، زندگی کی ہر حرکت دین کے ماتحت

ہے۔ تو دین کے لیے علم کا مطلب یہ ہے کہ علم کو آپ ــــ سائنس آپ حاصل کر رہے ہیں، مگر یہ سائنس آپ دین کے لیے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ دین کے معنی کیا ہیں: کہ اللہ کے حکم کے ماتحت؛ اللہ کی رضامندی کے معنی یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ایک پروانہ لکھ کر بھیج دیں گے۔ اللہ کی رضامندی کے معنی یہ ہیں کہ خلق خدا کی آپ خدمت کریں، انسانیت کے قافلہ کو آپ آگے بڑھایئے، انسانی اجتماع اور تمدن کو آپ ممکن فائدہ پہنچایئے۔ اگر آپ بم بھی بنائیں، ATOMIC ENERGY کے اوپر اگر آپ ریسیرچ کر رہے ہیں، تو یہ بھی عبادت ہے، یہ بھی ایک دین ہے۔ فرق صرف اتنا ہو جاتا ہے ATOMIC ENERGY کے اوپر اگر آپ اس لیے ریسیرچ کر رہے ہیں کہ آپ کو بم بنا کر انسانی آبادی کو تباہ کرنا ہے تو بس وہی کفر ہے۔ اور اگر یہ نہیں ہے بلکہ ATOMIC ENERGY سے آپ کو انسان کی تعمیر و ترقی اور سماج کی ترقی کا فائدہ لینا ہے، تو وہی دین ہے۔ اصل میں مغالطہ اور CONFUSION جو پیدا ہوتا ہے، وہ اس لیے ہوتا ہے کہ ہم دین کو بہت ہی محدود کر دیتے ہیں۔ یہ نہ ہو اگر ہم دین کا اتنا بڑا وسیع مفہوم لیں قرآن میں آپ دیکھیں گے کہ دین اسی معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ اور بخاری میں جو آتا ہے: انما الاعمال بالنیات۔ یہ تمام چیزیں ہر حرکت ہماری دین ہے؛

نقوی:- انسان کی ETERNITY کا آپ نے جو فرمایا ہے، وہ کیا ہے؟ وہ نہیں سمجھ میں آئی بات، کہ آپ عبدیت کے تصور کا کیا مفہوم ــ؟

اکبرآبادی: عبدیت؛ انسان کی۔

نقوی:- ابدیت!

اکبرآبادی:- عَبدیتْ! عَبدیّت! عَبدیت!!

بیدار:- مجھے ایک بات پوچھنی تھی سعید صاحب سے؛ اور وہ اس وجہ سے علی گڑھ کے تھیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے آپ صدر ہیں ــــ یہ سارا سلسلہ جو عام عربی مدارس کی تعلیم کے بارے میں چل رہا ہے اس سے بالکل ہٹ کے ــــ اس نصاب میں جو آپ کے یہاں رائج ہے، کوئی ترمیم

یا کوئی اضافہ، یا کوئی ایسی چیز سوچی گئی ہے یا آپ کے ذہن میں ہے ؟ یا یا کچھ کرنا چاہیئے ؟ یا جیسا کہ چل رہا ہے ۔ ویسے کا ویسا ہی آپ کے خیال میں مناسب ہے ؟

اکبر آبادی :- بات اصل میں یہ ہے کہ سر سید احمد خاں نے جو مدرسہ بنایا تھا، کالج اور ایک تعلیمی نظام انھوں نے رائج کیا تو ان کی تمام تحریروں کو دیکھنے سے اور ان کی تقریروں کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ درحقیقت ان کے سامنے جو اصل مقصد تھا، وہ انگریزی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو لانا تھا، تاکہ مسلمان انگریزوں کے اقتدار کے بعد جس ذلت، کا شکار ہو گئے ہیں، اس سے بچ جائیں اور نکل آئیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ

مسلمانوں کے ہاتھوں میں یہ بدگمانی تھی سر سید کے متعلق، بدظنی تھی ان سے ؛ اور ان کو کہتے تھے کہ یہ کرسچین ہیں، اور کرسچین بنانا چاہتے ہیں۔ نیچری بنانا چاہتے ہیں۔ تو اس قسم کی باتوں کی وجہ سے سر سید کو مسلمانوں کا کچھ اعتبار بھی حاصل کرنا تھا۔ نمبر ایک۔ نمبر دو یہ کہ بہرحال وہ مسلمان بھی تھے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ مسلمان تھے، اور یہ بھی سمجھتے تھے کہ مسلمان خواہ کچھ ہو جائے، سائنٹسٹ ہو، انجنیئر ہو، ڈاکٹر ہو، علم جدیدہ کا ماہر ہو لیکن بہرحال اس کو اپنے مذہب سے واقف ہونا چاہیئے، دینیات سے واقف ہونا چاہیئے، تو اس بنا پر انھوں نے دینیات کو لازمی قرار دیا تھا اور ابھی تک، حالاں کہ اب زمانہ بہت کافی آگے نکل گیا بہت ترقی ہو گئی ہے، اور بڑی بڑی تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں، اور اس کا چہرہ بہت کچھ بدل گیا ہے، اور جو باقی رہ گیا ہے وہ بھی بدل جائے گا، کیوں کہ زمانہ کی طاقت کا مقابلہ بہت مشکل ہے، اس کے باوجود وکٹوریہ گیٹ کے اوپر محراب میں جو عربی عبارت لکھی ہوئی ہے، جسے منشور کہنا چاہیئے سر سید کا، اس میں صاف طور پر یہ لکھا ہوا ہے کہ "یہ مدرسہ، کالج اس لیے قائم کیا گیا ہے کہ یہاں کے بچے ایک ہاتھ میں دین اور ایک ہاتھ میں دنیا رکھیں"۔ تو سر سید یقیناً بہت مخلص، بڑے سچے اور بڑے پکے مسلمان

تھے؛ لیکن بعد میں جو تبدیلیاں ہوئیں، اور جو معاشرہ پیدا ہوا — خود میرے بچپن کی بات ہے کہ میرے ایک چچازاد بھائی علی گڑھ میں پڑھتے تھے، یہاں جب وہ گئے تو ان کی حالت یہ تھی کہ وہ اُردو میں بولنا اپنی توہین سمجھتے تھے، بعد میں جب خلافت موومنٹ پیدا ہوئی اور قومی تحریکیں پیدا ہوئی ہیں، تو پھر بعد میں رنگ بدلا ہے؛ مگر اس زمانہ میں رنگ یہی تھا کہ انگریزوں کی پیروی

کرو۔ انگریزوں کا اتباع کرو، انگریزوں کے نقش قدم پر چلو، ان کی طرح کھاؤ ان کی طرح پیو، اٹھو بیٹھو۔ تو اس دور میں دینیات محض دکھاوے کے لیے رہ گئی؛ باقاعدہ اس کا ڈیپارٹمنٹ کوئی نہیں تھا۔ ناظم دینیات کی حیثیت سے مولانا سلیمان اشرف صاحب تھے، مولانا عبدالرشید صاحب تھے۔ لکچر ہوتے تھے، مگر اس کے لیے کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ کبھی کسی عنوان پر دے دیئے کبھی کسی پر۔ یہ حالت چلی آئی اس کی۔ یہاں تک کہ سن ۵۸ء جب ہمارے بشیر زیدی صاحب وائس چانسلر تھے، تو انھوں نے مجھ کو بلایا اور مولانا علی نقی صاحب کو بلایا۔ اور اس میں ریڈر شپ پیدا کی پہلی مرتبہ۔ پہلے ریڈر شپ نہیں تھی، اور ڈیپارٹمنٹ ہی نہیں تھا، اس کی فیکلٹی الگ تھی لیکن ڈین آرٹ فیکلٹی کا بیٹھ پی۔ وی۔ سی ہوتا تھا۔ کیوں کہ قاعدہ یہ ہے کہ جب ڈیپارٹمنٹ کے اندر ریڈر کوئی نہ ہو تو اس کا براہ راست تعلق پی وی سی سے ہوتا ہے، تو جب میں آیا تو میں سینیر تھا تو میں ڈین بھی ہو گیا۔ تو مجھے بحیثیت ڈین کے زیادہ اختیارات تھے، اصلاح کے؛ ترقی کے۔ تو میں نے یہ دیکھا کہ "بی ٹی ایچ" اور "ایم ٹی ایچ" کا کورس محض دکھاوے کے لیے ہے۔ کیوں کہ ہمارے یہاں "بی۔ ٹی ایچ" کے اندر نورالانوار بھی پڑھائی جاتی ہے، اصول شاشی بھی، ہدایہ بھی، سراجی بھی، حجۃ اللہ البالغہ بھی۔ پڑھنے والے وہ ہوتے ہیں، جو عربی کا ایک حرف بھی نہیں جانتے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صاحب ہدایہ پڑھا رہے ہیں، اور لڑکوں کو لکھا دیا کہ لکھو اس کا ترجمہ وہ لکھ لیا انھوں نے، اور پاس ہو گئے، اللہ اللہ خیر صلا۔ میں جب گیا میں نے کہا کہ یہ چیز بالکل غلط ہے۔ عربی کو میں نے COMPULSORY کر دیا ہے۔ مگر ظاہر بات ہے کو اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ بی۔ ٹی ایچ کے اندر تو وہ بالکل ابتدائی

عربی پڑھتے ہوئے ہوتے ہیں، تو پی ایچ ڈی میں اب تک محض اردو کے سہارے گزارہ ہوتا ہے، اردو کے سہارے پڑھتے ہیں اور اردو ہی کے نوٹ ووٹ لکھ لیتے ہیں، اور عربی پڑھتے رہتے ہیں۔ البتہ دو سال کی عربی کے بعد وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ "ایم فل اے" کے اندر جو کتابیں، ان کو وہ عربی کے اندر پڑھ سکیں۔ میں چاہتا تھا کہ اور مزید اس میں ترمیم ہو۔ لیکن حالات ایسے ———— ہیں کہ اس کے اندر اور کچھ زیادہ اصلاح ہو نہیں سکتی ہے۔ اس واسطے کہ عام طور پر جو لڑکے داخلہ لیتے ہیں، وہ وظیفہ کے لیے لیتے ہیں۔ ہچانوے فی صدی۔ کیوں کہ ۲۵ روپے پہلے وظیفہ تھا، اب ۳۰ ہو گیا ہے اس کے لیے۔ اور ہوتا ہے ڈبل کورس ان کا۔ یعنی ادھر ایم اے کے اندر بھی داخل ہوتے ہیں، ایم۔ ایس سی۔ کے اندر بھی ہوتے ہیں؛ تو ادھر سے جو کچھ بھی تھوڑا بہت وقت ملتا ہے وہ اپنے "بی۔ ٹی۔ ایچ" میں آ گئے تو ہم "بی۔ ٹی۔ ایچ" کو جیسا کہ ہم چاہتے ہیں بڑھانا، ترقی کرنا، وہ ہم نہیں کر سکتے تھے اور اسی وجہ سے زیدی صاحب جب وائس چانسلر تھے تو میں نے یہ تجویز کی تھی کہ جس طرح آپ کے یہاں طبیہ کالج ہے، اسی طرح سے ایک دینیات کالج آپ بنائیے، جس کے اندر بالکل ایک نیا نصاب ہو۔ جس کے اندر وہ تمام چیزیں ہوں، اور آٹھ سال کا کورس ہو ———— تو، بہر حال پہلے سے تو کافی ترقی ہو گئی ہے اب۔ "مذاہب کا تقابلی مطالعہ" اس کا بھی ایک مستقل پرچہ ہے سو نمبر کا ————

ببیل اد:- تو تقریباً فضول ہے، موجودہ صورت میں؟

اکبر آبادی:- نہیں، فضول تو خیر نہیں ہے بھئی۔ لیکن بہر حال ابھی ع

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

اس درجہ میں ہے لیکن ہماری خاطر خواہ نہیں ہے ———— ہمارے شبیر احمد غوری بھی "پی ایچ ڈی" کیے ہوئے ہیں۔ ان کو اندازہ ہوگا ضرور کہ اس میں کیا ہوتا ہے۔

غوری:- جی، میں نے ۱۹۳۸ء کے اندر کی۔ اس زمانے میں یہ صورت حال نہیں تھی۔ اس زمانے کے اندر وہی طالب علم آتے تھے جن کے پاس

دائم جلالی ؒ

عربی مدارس ہیں کیوں؟ اور کیوں ہوئے؟ ہندستان کے اندر، پاکستان کے اندر، افغانستان کے اندر، ترکستان کے اندر، یہ ہوئے کیوں؟ اور کب سے ہوئے؟ اور اس میں کیا پڑھایا جاتا تھا؟ اور اب کیا پڑھایا جاتا ہے؟

بنی امیّہ کے آخری دور سے جب ترجمے شروع ہوئے یونان کی کتابوں کے، یونان کیوں کہیئے، ارسطو کی کتابوں کے، انہیں افلاطون کی کتابوں کا تو نام نہیں تھا، فلسفۂ اشراق کا الا ماشاء اللہ ایک آدھ جگہ؛ تو ارسطو کی کتابوں کے تراجم ہوئے۔ اور عربی میں لوگوں نے ان کو پڑھا۔ وہ کیا تھے؟ کچھ طبیعیات تھے۔ مکان کی بحث تھی، زمان کی بحث تھی، حرکت کی بحث تھی، علت العلل کی بحث تھی علت العلل سے خاص ساری کائنات کا صدور تھا؟ صدرِ اول کس کا ہوا تھا؟ اس قسم کی بحثیں تھیں، تو بعض بحثیں تو ایسی تھیں جو اسلام کے نہ موافق تھیں نہ مخالف تھیں۔ اسلام کا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن کچھ چیزیں ایسی تھیں جن کا ٹکراؤ ہوتا اسلامی عقائد سے۔ مثال کے طور پہ مادّہ کا قِدم تھا جو ابن سینا نے کہا ہے مادّہ کی بحث میں "ومنہا و نظاہر ثلاث نکات"۔ یہیں سے تین نکتے ظاہر ہوگئے، قِدمِ عالم ثابت ہوگیا۔ اب اس سے ٹکراؤ پیدا ہوا، ان کو حاصل کیا۔ حاصل کرنے کے بعد علم العقائد کی بحث چھڑ گئی۔ کچھ مسلمان فلسفہ کی رَد میں بہہ گئے۔ کچھ مسلمانوں نے ان علوم کو حاصل کرنے کے بعد اپنے آپ پر خود کیا، قرآن پر غور کیا، حدیث پر غور کیا اور عقل پر، اور زیادہ غور کیا عقل سے۔ اور پھر انھیں فلسفیوں کے اسلحہ سے انھیں کا مقابلہ کیا۔ یوں چلتا رہا قصہ ایک مدت تک۔ اس کو آپ جبریہ کہہ لیجئے اور اس کو قدریہ کہہ لیجئے، معتزلہ کہہ لیجئے، کچھ اور کہہ لیجئے۔ بہرصورت

یوں چلا سلسلہ ابن ندیم کا ابن طفیل کا! ان لوگوں کا قصہ چلتا رہا۔ یوں منتقل ہوتے ہوئے اب آیا دور ترکستان کا۔ ترکستان میں علم کلام اور فلسفہ اور طبیعیات کی کتابیں جو پہلے ترجمہ عربی میں ہو چکی تھیں، وہ بھی آئیں اور کچھ مسلمانوں کی تصنیفات بھی ان کے ساتھ ساتھ شامل ہوئیں۔ بطور تردید یا بطور تائید دونوں طریقہ سے آئیں۔ ہمارے متقدمین تو فلسفۂ ارسطو کو پڑھنے کے بعد بالکل اس کے حامی بن

ؒ سابق پرنسپل مدرسۂ عالیہ رام پور؛ قدیم طرز کے علما میں تنہا فیرو متفکر

گئے، آستینیں چڑھا کر اس کی طرفداری کرنے لگے، جیسے ابہری؛ بعض لوگوں نے تردید کے طور پر اس کو حاصل کیا۔ یہ دَور گزر گیا۔ اب ہمارے پاس ہندستان میں جتنا ذخیرہ آیا وہ ترکستان سے آیا۔ یہ ہدایہ جو آپ کے درس میں داخل ہے؛ تالیفاتِ حدیث بیشتر ہماری اسی جگہ سے آئیں، بخاری آئی، ترمذی آئی، قزوینی کی آئی، ابی داؤد سجستانی کی آئی، یہ تمام کتابیں جو صحاح کی ہیں یہ ہماری ترکستانی تالیفات ہیں۔ فقہ بھی ہماری انھیں راستوں سے آئی، اور ساتھ ساتھ منطق کی کتابیں اسی راستے سے آئیں۔ اور، چونکہ ترجمہ صرف ارسطو کی کتابوں کا ہوا تھا اس لئے ارسطو ہی کی کتابوں کے تراجم آئے؛ ——————

باقی جو یونانی فلاسفہ تھے ان کے کہیں کہیں چیدہ اقوال ملتے ہیں؛ اور کوئی مرتبہ فلسفہ نہیں ملا۔ اور اب آ گئے ہندستان میں، اور ہم نے ان کو پڑھنا پڑھانا شروع کر دیا۔

ہندستان میں وہ کتابیں داخل کر لی گئیں، تو دو گروپ بن گئے یہاں پر ایک معقولاتی، دوسرا منقولاتی۔ معقولاتی (شاہ ولی اللہ) منقولاتی (فرنگی محل)، کچھ علما نے دیکھا دونوں علیحدہ علیحدہ تو چل نہیں سکتے، تو انھوں نے ایک درسگاہ بنائی کسی درخت کے نیچے بیٹھ کے، چھوٹی سی، جسے آپ کہتے ہیں درسگاہ دیوبند۔

یہ اس زمانہ کے لحاظ سے بہت مفید چیز تھی، لیکن وہی مضر بھی کہ اب وہی قدیم طریقہ قائم ہے اور قوتِ اجتہاد و تفکر مفقود۔ نتیجہ وہ ہے جو آپ کے سامنے ہے، ہم زمانے سے تصادم نہیں کر سکتے، اور جو ایسا کریں ہم انھیں اہلِ علم نہیں کہہ سکتے۔

اس بنا پر آپ کو ضرورت پڑی کہ اصلاح کریں۔ وقتاً فوقتاً یہ قدیم مدرسے خود بھی ترمیمیں کرتے رہے۔ مثلاً فرنگی محل، جہاں سلّم، قطبی اور میبذی رہ گئیں؛ باقی شمس بازغہ، شرح تجرید وغیرہ ختم۔ تو یہ کچھ تو زمانے کے ہاتھوں ہی ہوتا چلا رہا ہے، زمانے نے خود ہی ان کے ہاتھوں ختم کرا دیا ہے؛ اور یہ بھی ناکارہ ہیں، میبذی بھی تو ایک تاریخ فلسفہ ہے، فلسفہ کہاں ہے۔ فلسفہ تو زندہ کو کہتے ہیں، مُردہ فلسفہ فلسفہ کہاں ہے۔ اس کو اگر ہم پڑھیں تو تاریخ فلسفہ کی حیثیت سے پڑھ سکتے ہیں، نہ کہ علمی حیثیت سے۔ علم تو وہ اب رہا نہیں؛ اب تو دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی؛ وہ تو ایک جہالت رہ گئی، تاریخ جیسے ہوتی ہے ویسے ہی تاریخ فلسفہ بھی ہے، ان میں

کوئی فرق نہیں منطق کیا ہے، منطق چند مختصر اصولوں کا نام ہے، اس کے آگے کوئی منطق نہیں ہے۔ جتنی منطق کی کتابیں، وہ سب فلسفہ کی لڑائیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ الٰہیات قاضی اٹھا کے دیکھ لیجئے، ملا حسن کی بحثیں دیکھ لیجئے علم واجب کی، ساری کی ساری الٰہیات کی بحثیں ہیں، منطق سے کیا تعلق ہے ان کا۔ کوئی مسئلہ ان میں ایسا نظر نہیں آتا کہ منطق کا ہو۔ کیونکہ منطق کو تو ایک مرقات کافی ہے؛ اور منطق تو ایک بدیہی چیز ہے، ہر قوم میں، ہر زبان میں منطق ایک ہی رہے گی۔ کوئی فرق نہیں رہے گا۔ کوئی فرق اس کے اندر ہے ہی نہیں، آپ استقرا ہو بنا کریں یا برہان یہ رہے گی ایک ہی چیز۔ وہ حقیقت بدل نہیں سکتی۔ امام ابو حنیفہؒ نے منطق نہیں پڑھی تھی، لیکن تمام کلام ان کا مبنی ہے منطق پر؛ باوجودیکہ منطق کا ترجمہ بھی ان کے زمانے میں نہیں ہوا تھا۔ جن لوگوں نے منطق پڑھی تب، اور نہیں پڑھی تب، فطرت نے انھیں اصول کی طرف ان کی ہدایت کی؛ اور آج بھی انھیں اصول کی طرف فطرت

ہدایت کر رہی ہے؛ وہ ایک فطری چیز ہے۔ ہماری بحث یہ ہے کہ مدارس عربیہ کیوں قائم ہیں، اور کیوں قائم ہوئے؟ قائم ہوئے تھے فقط استحکام دین کے واسطے، بقائے دین کے لئے۔ دنیا کمانے کے لئے نہیں قائم ہوئے تھے، اس کو خوب سمجھ لیجئے۔ وہ بحثیں جو فلسفہ نے لا کر داخل کر دی تھیں، اور وہ اسلام شکن تھیں، ان کی تردید کے لئے نہیں ضرورت پڑی تھی کہ ہم درسگاہیں قائم کریں۔ کتابیں ہمارے پاس شروع میں نہیں تھیں، ہمارا طریقہ املا کا تھا، فقط لکھوانے کا تھا، لکچر کا تھا؛ یہ کتابیں بعد کو ہیں۔ اب ہم ان کتابوں میں جامد و منجمد ہو کے رہ گئے، اب ہمارا املا کا طریقہ بھی جاتا رہا۔ ضرورت ہے اس چیز کی کہ جس طرح ہم نے ارسطو کے نفس ناطقہ کی بحث کی تردید کی تھی، اسی صورت سے ہم تردید کریں۔ ان چیزوں کی جو روح کا انکار کرتے ہیں، اور روح کو روح طبّی میں منحصر سمجھتے ہیں، اور روح کو مادیت سے علاوہ کوئی شئے نہیں سمجھتے۔ آج ہمارے واسطے ضروری ہے کہ ہماری درسگاہوں کے اندر استحکام ہو اسلام کا۔ اور استحکام اسلام کا کیسے ہو؟ چند فقہ کے مسائل جاننے سے اسلام کا استحکام نہیں ہوتا ہے، ضرورت ہے اس چیز کی، کہ ہم علوم جدیدہ حاصل کریں۔ اب عربی میں بھی علوم جدیدہ آچکے ہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ کینٹ یا کارل مارکس انگریزی یا فرنچ یا کسی اور زبان ہی میں ہے، نہیں، عربی میں بھی موجود ہیں۔ کوئی چیز ایسی نہیں

ہے کہ عربی میں ترجمہ ہوکے نہیں آئی ہے۔ آپ اگر غور کریں گے اور اس کو پڑھیں گے اور پڑھائیں گے، اور پھر دیکھیں گے کہ اسلام کی کس طریقہ سے جڑیں کھودی گئی ہیں۔ —— روٹی کا مسئلہ تو حقیقتاً بہت ہی ذلیل مسئلہ ہے: صنعت وحرفت میں روٹی ہے، تجارت میں روٹی ہے، اور بہت سارے روٹی کے ذریعہ ہیں، ملازمت تو بہت حقیر ذریعہ ہے روٹی کا۔ ہمیں قائم رکھنا چاہیے ان مدارس کو استحکام اسلام کے لئے، استحکام اسلام ہمارا جبھی ہوگا جب اسلام پر دُنیا میں جو اعتراض کئے گئے ہیں ہم ان کا علم حاصل کریں، پھر ان کی تردید کریں۔ ورنہ یاد رکھئیے کہ مادیت جیسے کہ علیسائیت کو بہا کرلے گئی، جیسے اشتراکیت عیسائیت کو بہا کے لے گئی، آدھی دُنیا تو برائے نام بھی عیسائی نہیں رہی، اور آدھی جو برائے نام عیسائی رہ گئی ہے وہ نہیں ہے، حقیقت میں ایک فرقہ ہے، اس کو عیسائی کہا جاتا ہے، عقائد عیسائیت اس کے اندر نہیں ہیں۔ اگر آپ بھی اپنا برائے نام فرقہ اسلام رکھنا چاہتے ہیں، تو بالکل ٹھیک ہے، اس کو رکھ دیجئے یا اس کو رکھ دیجئے، سب برابر ہیں، اور اگر آپ واقعی ایک اسلام قائم کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو غور کرنا پڑے گا کہ درسگاہیں کیسے قائم رکھیں، اور ان میں کیا پڑھائیں؟

ابتدائی بنیادی تعلیم اگر دینا ہے آپ کو اسلام کی، تو شروع کے درجوں میں انھیں ابتدائی تعلیم دیدیجئے۔ پھر بچوں سے کہہ دیجئے کہ جاؤ، اسلام کے ابتدائی معلومات حاصل ہوگئے، اب کوئی صنعت سیکھو کوئی پیشہ سیکھو تمھارا اور کام نہیں آگے بڑھنے کا۔ لیکن جو اپنی زندگی وقف کرنا چاہتے ہیں، اور پیسوں کے تمنائی نہیں ہیں، فاقے مرنا چاہتے ہیں، لیکن استحکام اسلام چاہتے ہیں ان کو آنا چاہیے ان مدارس کے اندر۔ ہم نے اب جب کہ استحکام اسلام کو اپنی زندگی کا موضوع بنایا ہے تو ہم کو بوریا پر بیٹھنے میں ساری عمر کوئی تکلیف نہیں ہے، کوئی ضرورت نہیں ہے موٹر کی اور کوٹھی کی۔ اور اگر موٹر اور کوٹھی لینا ہے تو اس کے واسطے تو صنعت وحرفت ہے اور تجارت ہے، اور بڑا میدان ہے اس کا؛ یہ راستہ نہیں ہے دولت حاصل کرنے کا۔ ہم میں سے کوئی کوئی اتفاق سے جو آگے بڑھ گیا، ہمارے مولانا اکبرآبادی مثلاً ابتدا میں فتحپوری میں مدرس تھے، اس کے بعد انھوں نے علوم جدیدہ حاصل کیے، کچھ انگریزی پڑھی، ایم۔ اے ہوگئے،

کیا ہوئے؛ اچھا بڑھ گئے، دو ہزار اور تین ہزار تک بڑھ گئے، مگر ہماری نظر کے اندر ہماری بوریا نشینی سے آگے نہیں بڑھے۔ یہ میں آپ سے عرض کیئے دیتا ہوں۔ ہم جس جس جگہ پہ بیٹھے ہیں، اپنی جگہ پہ خوش ہیں بالکل۔ اب ہمیں بتائیے، کہ کون سا ذریعہ ہو استحکام اسلام کا۔ ہمارے دماغ میں جو کچھ آیا ہے وہ یہی آیا ہے کہ: پُرانے فلسفہ کی کتابیں ہٹا دو، کیوں کہ ان میں تاریخ جہالت ہے، منطق کو ختم کردو، مرقات کا ابتدائی رسالہ کافی ہے، یا کوئی اور بھی رسالہ رکھ لو۔ پھر فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم دو، اصول تفسیر کی تعلیم دو، اور صرف املا کی تعلیم! اتنے لمبے چوڑے اس جھنجھٹ میں مت پھنسو۔ البتہ جو تخصص حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے واسطے ضرور ہے کہ نظر اس کی بہت ہی زیادہ وسیع ہو۔ لیکن ابتدائی معلومات کے واسطے تو ابتدائی املا کی تعلیم ہی کافی ہے؛ ہمارے متقدمین املا سے تعلیم دیا کرتے تھے۔

عبدالخالق نقوی[1]

ابھی مولوی سعید احمد صاحب نے اپنے مقالے کی ابتدا میں کہا کہ میں نے چلتے چلتے یہ تحریر لکھ لی، جیسے ہمارے شعرا مشاعرے میں غزل پڑھتے وقت کہتے ہیں۔ یہ طریقہ ٹھیک نہیں، پھر موضوع کچھ اور تھا اور انھوں نے ابتدا ذکر آدم سے کی۔ اگر بات وہاں تک پہنچانا ہے تو پھر ادھر تو یہ بھی سوال اٹھ سکتا ہے کہ فرشتوں پر آدم کو ترجیح اس طرح دی گئی کہ سارے اسماء آدم کو بتلا دیئے اور پھر فرشتوں سے پوچھا، تو اس میں آدم کی فضیلت کیا ہوئی۔ پیپر تو پہلے ہی آؤٹ کر دیا تھا۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی دوسرے "طلب العلم فریضۃ" اچھی حدیث ہے لیکن علماء کہتے ہیں یہ موضوع حدیث ہے۔ بہت سی حدیثیں ہیں جن کے مضمون بہت معقول ہیں، لیکن اسناد کی رو سے وہ ضعیف ہوتی ہیں۔ مثلاً یہی حدیث ہے۔ اگرچہ بات بہت اچھی ہے، دوسری "دلو کان بالصین"، کے بارے میں نہیں جانتا، لیکن دیکھنا اسے بھی چاہیئے۔

پھر مولانا نے ایک جگہ "علم ہندسہ و علوم ریاضیہ" لکھا ہے۔ ہندسہ سے علوم

[1] مفکر عالم، وزارت دفاع کے عہدہ سے الگ ہوئے، عربی میں ایم اے...

ریاضیہ کا جزو ہے اس طرح اسے الگ لکھنا مناسب نہیں

جامعہ ازہر کے سلسلہ میں مولانا نے لکھا ہے کہ اس میں ۱۹ ویں صدی میں جمود کی حالت تھی؛ لیکن سعد زغلول، مفتی محمد عبدہٗ اسی زمانہ کی پیداوار ہیں۔ اصل میں جمود کا زمانہ اس سے پہلے کا تھا۔ نپولین کے حملہ کے بعد ہوش آگیا اور ان لوگوں نے سوچنا شروع کر دیا تھا۔

مولانا نے ایک شخص سارٹن کا حوالہ دیا ہے۔ ان لوگوں کے طرز فکر میں بنیادی کجی ہے۔ ان کے بیانات کو اس طرح اہمیت دینا ٹھیک نہیں۔

اصلاح نصاب کے سلسلہ میں بعض اقدامات کا ذکر ہوا۔ ایک کمیٹی اس سلسلہ میں بھوپال میں بھی بنائی گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ جب جامعہ ملیہ کی سلور جوبلی ہو رہی تھی۔ اس موقع پر موسٹی جارا للہ نے بمبئی سے ذاکر صاحب کو ایک نصاب تعلیم مرتب کرکے بھیجا تھا۔ انھوں نے اس میں یہ بتلایا تھا کہ سب سے پہلے یہ فیصلہ ضروری ہے کہ ہم اپنے بچوں کو کیا بنانا چاہتے ہیں؛ انجینئر اور ڈاکٹر بنانا ہو تو ابتدائی اسلامی تعلیم دے کر مثلاً علی گڑھ بھیج دیں، لیکن اگر اسلام کے مبلغ بنانا چاہتے ہیں اور اس کی تعلیم کو ان کی زندگیوں پر نافذ کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے یہ نصاب ہے۔ انھوں نے یہ نصاب عربی میں لکھا تھا میں نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

کتابوں کا جہاں تک تعلق ہے، شافیہ کافیہ ازکاررفتہ ہوں، ٹھیک ہے انھیں نہ پڑھائیے۔ لیکن جو مسائل ان کتابوں میں ہیں انھیں تو پڑھانا ضروری ہی ہے۔ اپنے طریقے سے پڑھائیے۔ عربی زبان کے لئے یہ علم تو ناگزیر ہے۔

اور اصل میں ہمارے اساتذہ کی یہ کمزوری بھی رہی کہ صرف پڑھانا مقصود نہیں رہا۔ بلکہ شافیہ! اُستاد خود شرح دیکھتے ہیں، حاشیہ دیکھتے ہیں تو طالب علم میں اجتہادی کیفیت کہاں سے آئے۔ ایک طالب جس نے بارہ سال دینی مدرسہ میں تعلیم پائی۔ مجھ سے کہنے لگا بارہ سال میں ہم جو چیز حاصل کرتے ہیں، وہ آپ اپنے اسکول میں بارہ مہینے میں کیسے سکھا دیتے ہیں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ مگر ہم اپنے طالب علم کو کم سے کم اتنا ضرور کر دیتے ہیں کہ عربی کے بارہ مہینوں کے نام بتا سکے، اور یہ کہ کہاں الف لام لگے گا کہاں نہیں۔ ہم کم سے کم انھیں حروف ہی کے ناموں میں غلطی کرتے نہیں سنتے، کیا تم یہ نام صحت کے ساتھ بتا سکتے ہو؟

تو مسئلہ اساتذہ کا بھی ہے۔

کسی بھی شہر میں جہاں تھوڑی بہت مسلم آبادی ہے، وہاں کچھ نہ کچھ ایسے مدرسے ضرور قائم ہیں۔ تو اچھا ہے اگر ہم ایک نصاب بنائیں اور اسی راستے پر چلنے کی کوشش کرائیں کہ سب مشترک ہوں، اور ان مدارس کو ایک نظم میں پرونے کی کوشش کی جائے۔

یوں ہمیشہ دنیا میں ہوتا یہ آیا ہے کہ کوئی سرپھرا دیوانہ آدمی اٹھتا ہے اور وہ کوئی کام انجام دیتا ہے۔ کام کرنے والا کوئی ایک ہی ہوتا ہے۔

تعلیم کے مقصد کو بہر حال سامنے رکھنا ضروری ہوگا، اور اس تعلیم کا مقصد صرف یہی نہیں ہوتا کہ کہیں نوکری مل جائے، آل انڈیا ریڈیو میں یا وزارت خارجہ میں بلکہ ذہن و تاریکی و غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانا، یہ کہ فکر کے دریچے کھلیں، اور آزاد قوم کی امنگیں پیدا ہوں۔ وہ جو اقبال نے کہا ہے

یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوب گماں تو ہے

اور: یقیں پیدا کر اے غافل یقیں سے ہاتھ آتی ہے

وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

اب وہ یقین کہاں ہے!!

اچھے سے اچھا نصاب بنایئے، تعلیم دینے والے میں جذبہ اور اسپرٹ نہ ہو تو کوئی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ سعید انصاری صاحب کے بقول، ہمارے دینی مدارس میں علی گڑھ اور جامعہ کو چھوڑ کے، ایسا کوئی انتظام نہیں کہ ان اساتذہ کی تربیت ہو اور وہ بھی فن تعلیم سے واقف ہوں۔ حدیث و فقہ وغیرہ کو کیسے پڑھایا جائے، اس سب کے لیے ایک تربیت یافتہ گروہ کی یقیناً ضرورت ہے۔

مگر سب سے بڑھ کے یہ کہ ہم کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ مدارس عربیہ یا مدارس دینیہ کا مقصد کیا ہے؟

سب سے پہلے تو یہی کہ طلبہ مذہب اسلام سے واقف ہوں، ٹھیک ہے۔ مگر قدیم طرز کی کتابیں اب اس کے لیے زیادہ سودمند نہیں۔ لیکن یہاں میں ایک اور پہلو کی طرف بھی آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس وقت

یہ بھی دیکھنا ہے کہ کوئی بھی مذہب ہو وہ کس حد تک سوسائٹی کے لیے مفید ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام ایک اہم رول اور کردار ادا کرسکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہم سب کا یہ بھی فرض ہے کہ اسلام کے اس پہلو کو نمایاں کریں۔ اور اگر واقعی ایسا نہیں، اور ہم سمجھتے بھی نہیں ہیں تو پھر منافقت برتنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ مثلاً آپ نے ابھی سُنا کہ ہمارے علماء جو پیسہ صرف کر سکتے ہیں، اپنے بچوں کو ان مدارس میں بھیجتے ہیں جو جدید تعلیم دیتے ہیں۔ اس کا مطلب صاف طور سے یہ ہے کہ وہ خود ایک کو پسندیدہ، اور دوسرے کو ناپسندیدہ سمجھتے ہیں۔

تو اگر ضرورت نے ثابت کر دیا ہے، اور اگر ہم اس نظام تعلیم کو غیر ضروری سمجھتے ہیں تو اس سے بڑی کوئی منافقت نہیں۔ روپیہ، پیسہ اور انرجی ایسی جگہ صرف کریں، کیا بہتر نہ ہوگا کہ مناسب مصرف نکالیں۔

اور اگر یہی نظام رکھنا ہے تو پھر کم سے کم یہی سوچنا چاہیئے کہ دینی تعلیم کیسے مکمل ہو سکتی ہے جب تک اس زمانہ کے وہ ادیان خاص کر وہ جن کا تعلق اسلام سے ہے، ان کا بھی مطالعہ نہ کریں۔ عیسائیت، ہندومت، بدھ مت وغیرہ۔ یا اس وقت کا اہم نظریہ کمیونزم، کہ وہ بھی ایک دین ہے، یہ معلوم ہو جانا چاہیئے ان طلبا کو، کہ کیا چیز کیا ہے، کس کی اہمیت ہے، اس طرح سے ہمارے طلباء کو جمود سے بھی آزادی مل سکے گی۔

اعظمی :-

ڈاکٹر عبدالعلیم¹

حضرات! مجھے بہت خوشی ہے کہ مجھے اس صحبت میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اس موضوع کی اہمیت کا آپ سب لوگوں کو اندازہ ہے، زیادہ تفصیل سے تقریر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ ہمارے وہ مدارس جنھیں عام طور پر عربی مدارس کہا جاتا ہے، انھوں نے پچھلے زمانے میں بہت خدمات انجام دی ہیں، اور ان سے وہ لوگ پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے ہماری تہذیبی اور تعلیمی زندگی میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ موجودہ زمانے میں ضرورت ہے (اس جائزے کی) کہ وہ جو نصاب پڑھائے جاتے ہیں۔ ان کی افادیت کس حد تک ہے، اور وہ کتابیں جو پڑھائی جاتی ہیں۔

میں اس سلسلہ میں کچھ کام کر چکا ہوں۔

مولانا آزاد نے جو کچھ کیا تھا، اس کی پوری تاریخ شاید آپ لوگوں کو معلوم نہیں۔ ۱۹۳۷ء میں جب یو۔پی کانگریس حکومت بنی تو دو کمیٹیاں بنائی گئیں، ایک سنسکرت مدارس کے نصاب کے لیے، دوسری عربی کے لیے۔ عربی کمیٹی کے صدر مولانا آزاد تھے۔ اس زمانہ میں وہ وزیر نہیں ہوئے تھے۔ لیکن کچھ حالات ایسے رہے کہ اس کمیٹی کی کارروائی مکمل نہ ہو سکی۔ پھر دوبارہ جب کانگریس حکومت قائم ہوئی تو پھر وہ کمیٹی بنی، اور اس میں کچھ توسیع بھی کی گئی۔ اس میں حسین احمد مرحوم، حفظ الرحمٰن مرحوم اور سید سلیمان ندوی مرحوم بھی تھے، شیعہ علماء میں سے بھی ایک دو تھے۔ میں بھی اس میں تھا۔ یہ سلسلہ میرے خیال میں کئی سال چلا۔ اب مولانا وزیر ہو گئے تھے، اس لیے وہ مصروفیات کی وجہ سے پوری توجہ نہ دے سکے۔ ایک جلسہ آخر میں ان کے مکان پر ہوا تھا، جس میں سب لوگ شریک ہوئے تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جس کے دوسرے دن دہلی میں فساد ہو گیا، جب کہ ہم لوگ واپس جا بھی نہیں

---

¹ علوم مذہبیہ و اسلامیہ کے ماہر، ادارۂ علوم اسلامیہ کے سابق ڈائرکٹر، اور اب علی گڑھ کے وائس چانسلر

بلائے تھے۔ بہر حال اس کمیٹی کی رپورٹ تیار ہوگئی، اور نصاب بھی تفصیل سے تیار ہوگیا، لیکن وہ نافذ نہیں ہو سکا۔ کیوں کہ مولانا مرحوم نے کہا تھا کہ وہ ایک نوٹ لکھیں گے جو یو۔پی گورنمنٹ کو جائے گا۔ یہ ایک سرکاری کمیٹی تھی، سرکاری حد تک تو نافذ ہو ہی جاتا۔

آزاد مدارس پر یہ لازمی طور سے نافذ نہیں ہوتا۔ ندوہ والوں کے سامنے مولانا آزاد کمیٹی کمیٹی کا مرتبہ نصاب رکھا گیا تو انھوں نے کہا ہم اسے پورے طور سے قبول نہیں کریں گے لیکن اپنے طور سے اسے استعمال کریں گے۔ لیکن جب وہ سامنے آتا اور اس پر سرکاری مدارس میں عمل ہوتا تو کچھ نہ کچھ ہوتا ہی، بہر حال وہ چیز بھی نہ ہو سکی۔ حالانکہ وہ نصاب چھپ گیا تھا، اگرچہ تقسیم نہ ہو سکا۔

جو بحث آج ہوئی ہے۔ اس کو ایک طور پر ختم کرنے کے لیے صدر کے فرائض میں سے یہ ہے کہ جو کچھ لوگوں نے کہا ہے اس کا خلاصہ پیش کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کی گفتگو میں کچھ خلط مبحث ہو گیا ہے۔ اس سیمنار کا مقصد جو میں سمجھا تھا، وہ یہ تھا کہ بہت بڑی تعداد میں ہمارے یہ مدارس موجود ہیں، اور موجود رہیں گے، اگر کوئی ایسی صورت سمجھ میں آئے کہ موجودہ زمانے کے جو تقاضے ہیں ان کو پیش نظر رکھ کر ان مدارس اور بالخصوص ان کے نصاب میں کوئی اصلاح ہو سکے تو اس کے بارے میں غور کیا جائے۔

یہ سوال کہ سارے ہندستان کے مسلمانوں کے سامنے کیا مقصد ہو، اور مجموعی اصلاح کا کام کیا جائے، یہ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اس کے لیے دوسری بحث کی ضرورت ہے۔ کچھ اور لوگوں کو بلانا چاہیے تھا، اس لیے کہ مسلمانوں کی تعلیم کا آپ ذکر کریں گے تو ان اداروں پر بھی بحث کرنی ہوگی جن کے نام کے ساتھ مسلم لگا ہوا ہے۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ آج کا مقصد یہ ہے کہ ایسے مدارس موجود ہیں جن میں دینی تعلیم ہوتی ہے، اور جن کا بنیادی مقصد ہی دینی تعلیم ہے، تو ان کے بارے میں کچھ غور کیا جائے۔ اگر یہ محدود مقصد پیش نظر رکھ کر ہم گفتگو کریں تو زیادہ مفید ہو گا۔

یہ چیز تو ظاہر ہے کہ دینی مدارس، مدارس عربیہ دینیہ، ان کا مقصد دین کی تعلیم ہے۔ اور ان کا بنیادی مقصد یہ نہیں کہ ذریعہ معاش فراہم کریں۔ اس

حد تک تو اتفاق را ... ہے۔ اب یہ کہ ان مدارس میں کچھ ایسی بھی تعلیم دی جائے کہ جو طلباء وہاں سے فارغ ہو کے نکلتے ہیں ان کے لیے دنیا میں معاش حاصل کرنا بھی ممکن ہو جائے، ان کا موجودہ دنیا سے ربط رہے، اگلا قدم ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ترمیم و اصلاح کی جو کوششیں کی گئی ہیں اور جن کا احساس تمام مشہور مدارس کو ہو گیا ہے یہ کہ جو علوم پڑھائے جاتے تھے، ان کے ساتھ ساتھ کچھ جدید علوم بھی ہوں ـــــ مگر مقصود وہی دین رہے۔ اس کے لیے یہ احساس ہو رہا ہے کہ ہندسہ، ریاضی، فلسفہ یونان وغیرہ، ان میں اب ترمیم کی ضرورت ہے۔ فلسفہ میں جدید فلسفہ کی ضرورت ہے۔ اگر سائنس کا کچھ علم ہمیں حاصل نہیں ہوتا تو ہم موجودہ زمانہ میں مکمل نہیں کر سکتے۔

اس کا احساس پہلے بھی ہوا اور کم و بیش اب بھی ہو رہا ہے۔ جیسا کہ ندوہ کی مثال سامنے ہے۔ یہاں تک کہ دیوبند میں بھی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ خالص دینی تعلیم کا ادارہ ہے۔ وہاں بھی یہ احساس ہوا کہ کم سے کم اتنی انگریزی ضرور آجائے کہ اسلام پر جو کتابیں لکھی جارہی ہیں یا جن لوگوں تک اسلام کو پہنچانا ہے (اس میں مدد ملے)

تو اس حد تک جو گفتگو ہوئی ہے، اور جو ایک نصاب وقف کونسل کی طرف سے آیا ہے اس پر کچھ زیادہ تفصیل سے اگر بحث ہو تو مقصد... محدود سہی، مگر میں سمجھتا ہوں مفید ہوگا۔ اور اگر بنیادی مقصد اٹھائے جائیں تو میرے خیال سے نہ تو ہم نے تیاری کی ہے نہ ــــــــــ اس لیے خلط مبحث ہو جاتا ہے

یہ کہ ان دینی مدارس کی سندیں سرکاری ملازمتوں کے لیے تسلیم کی جائیں، یہ صحیح نقطہ نظر نہ ہوگا۔ آپ کچھ بھی کوشش کریں اب تو صورت حال یہ ہے کہ یونیورسٹیوں میں بھی طلباء کا رجحان ان مضامین کی طرف بڑھ رہا ہے، جن سے حاص

(میں سہولت ہو) سائنس، انجینرنگ، میڈیسن وغیرہ تاریخ، فلسفہ، ادب، وغیرہ کی طرف رجحان کم ہو رہا ہے، تو یہ توقع کرنا کہ دینی مدارس سے ایسے لوگ نکلیں گے جو دنیا والوں سے سرکاری یا نجی اداروں میں مقابلہ کر سکیں گے، یہ کوشش میرے خیال سے کامیاب نہیں ہوگی۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ یہ مختلف مدارس جو پھیلے ہوئے ہیں ان کو چلنا چاہیئے یا نہیں؟ اور چلیں تو کیسے؟

آپ کو دینی تعلیم دینا ہے کہ تو کچھ مرکز ایسے ضرور قائم کرنے ہوں گے جن میں اعلیٰ دینی تعلیم دی جا سکے۔ باقی بہت سے مدارس پھیلے ہوئے ہیں ان میں کمی کرنا ضروری ہے۔ اور زمانہ خود ہی کمی کر رہا ہے۔

لیکن یہ بھی ہے کہ آپ کے کہنے سے وہ بند تو نہیں ہو جائیں گے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ... پھر ان مدارس میں ایسی اصلاح ہو کہ وہاں فارغ تعلیم کے موجودہ دھارے میں آجائیں، اسی لیے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ مختلف سندوں (کے متعلق مرحلے قائم) ہو جائیں، کوئی ابتدائی کے بعد چھوڑنا چاہتا ہے چھوڑ دے، کوئی فارغ التحصیل ہونے کے بعد چھوڑے گا۔

مثال کے طور پر یہ کہا گیا ہے کہ دیوبند یا ندوہ سے فارغ کے لیے یونیورسٹیوں میں کیا انتظام کیا جائے۔ مولانا آزاد کمیٹی میں اس سے بھی بحث ہوئی تھی۔

آپ کو خیال ہوگا مصر میں ایک ادارہ کلیہ دار العلوم قائم ہوا تھا، جس کا مقصد ازہر اور جامعہ فواد کے درمیان ایک پل کے طور پر کام دینا تھا۔ یہ اب بھی قائم ہے مگر اب اصلاح کے بعد ازہر میں کیا صورت ہے پتہ نہیں۔

تو ہمیں یہ بھی سوچنا ہے۔ ترجیح کرکے ضروریات کے تحت تعلیم یہ بھی ایک عملی مسئلہ ہے۔

اور اگر بہت اونچے مقاصد ہوں اور عمل کچھ نہ ہو تو بے فائدہ ہے۔ اپنی جگہ پر یہ بحث جاری رکھیے کہ مسلمان کے فرائض کیا ہیں اور تعلیم کے مقاصد کیا ہیں۔ لیکن جو عملی بحث میرے خیال میں ہے وہ یہ ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں جو ان مدارس کے طلبہ نکلتے ہیں انھیں آپ بنیادی کش مکش میں حصہ

لینے کے قابل بنانا چاہتے ہیں یا نہیں؟

اس لحاظ سے یہ کوشش ٹھیک ہے کہ ان مدارس میں انگریزی، جدید علوم، جدید تاریخ، جغرافیہ اور سائنس وغیرہ کے مبادی داخل نصاب کیے جائیں، اور اس کی کوشش کی جائے کہ ان مدارس میں تعلیم کے سلسلہ میں یہ احساس پیدا ہو جائے۔ محض تبلیغ کے لیے بھی تو یہ سب ضروری ہی ہے۔

اگر آج ہم یہ کرتے کہ کسی ایک نصاب کو لے کر، یا مثلاً کتابچے کو جو وقف کونسل نے مرتب کیا ہے سامنے رکھ کر اس پر تفصیل سے بحث ہوتی تو شاید زیادہ فائدہ ہوتا؛ تو آج یا پھر کبھی اس پر تفصیل سے بحث ہونی چاہیے کہ نصاب کیا ہونا چاہیے۔ اور کیا نہیں، کتابیں تو خیر بحث میں آئیں گی ہی، مگر اس سے زیادہ ضروری یہ کہ علوم کون سے ہوں۔

میں سمجھتا ہوں یہ محدود مقصد سامنے رکھ کے، ایک ایسا سیمینار ہو، جس میں ہمارے جو مشہور مدارس ہیں، ان کے نمائندے ہوں۔ یہاں دیوبند کے پڑھے ہوئے لوگ تو ہیں۔ دیوبند کے نظام تعلیم کا نمائندہ کوئی نہیں۔ ندوہ کا کوئی نہیں، جامعہ عمرآباد کا کوئی نہیں۔ یہ سب نمائندے ہوں اور بیٹھ کر یہ غور کریں کہ کس حد تک ترمیم کے لیے تیار ہیں۔ ان کے خیالات بھی تو معلوم ہوں۔ ہم اپنی جگہ نصاب بنا کر یہ سمجھیں کہ فرض ادا ہو گیا۔ تو یہ ٹھیک نہیں، وہ جو یہ نظام چلا رہے ہیں، ان سے تبادلۂ خیال کی ضرورت ہے تاکہ کوئی ایسی راہ نکل سکے۔

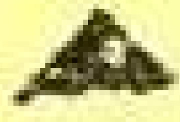
پھر کوئی ضروری نہیں کہ ہر مدرسہ ایک چیز پڑھاوے؛ نہ ضروری ہے کہ ٹیکسٹ بک یکساں ہوں۔

اپنے مقاصد اور خیالات کو پیش نظر رکھ کر ترمیم ہو تو یہ اچھا قدم ہو گا۔

مولانا آزاد کمیٹی میں دیوبند، ندوہ اور شیعہ حضرات بھی تھے، جو

مدارس چلا رہے ہیں۔ وقف کونسل والی کمیٹی میں بھی ایک شیعہ عالم موجود تھے۔ اگر اس کوشش کو اور آگے بڑھایا جائے تو ضرور فائدہ ہوگا۔

اور یہ بات کہ ایک ایسا نمونہ کا ادارہ قائم ہو جس میں نیا نصاب چلا کے نمونہ کے لوگ پیدا کر کے دکھا دیں، ان سے ایسے طلبا نکلیں، جو ہندستان میں انقلاب پیدا کر دیں۔ یہ محض وِش فل تھنکنگ ہے۔ ضرورت تھی ایسے مدارس کی جہاں اُردو ذریعۂ تعلیم ہوتی۔ ایسے ادارے تک بنانا مشکل رہا کہ لوگ تیار نہیں ہوتے۔ تو یہ نیک خواہش کہہ لیجئے عملی بات نہیں ہے۔ عملی بات یہی ہے کہ اس وقت جو مدارس قائم ہیں ان میں جس حد تک اصلاح ہو سکے، (ہو جائے۔)



نوادر

مولانا آزاد کمیٹی

"نصاب مجوزہ، برائے مدارس عربیہ و فارسیہ، مرتبہ عربی و فارسی کمیٹی مقرر کردہ یو.پی گورنمنٹ" کے نام سے $\frac{20\times30}{16}$ سائز کے ۱۸۵/۳۲ صفحات پر مشتمل یہ نصاب غالباً ۱۹۵۱ء کے آس پاس چھپ گیا تھا، لیکن مولانا کی دوسری مصروفیات کے باعث یو.پی گورنمنٹ کو مولانا کے سفارشی خط کے ساتھ بھیجا نہ جا سکا، اس لئے عمل در آمد کا کوئی سوال پیدا نہ ہوا۔ اس میں کل مدت تعلیم ۱۶ سال رکھی گئی تھی: درجۂ اولیہ پانچ سال، درجۂ ثانویہ تین سال، درجۂ عالیہ (مولوی: ۳ سال، عالم: ۲ سال فاضل: ۲ سال — اور علامہ: ۲ سال): ۱۰ سال

خصوصیت اس نصاب کی اگر کچھ تھی تو یہ کہ فلسفہ، ریاضیات اور اقتصادیات جیسے علوم کے ساتھ ایک ایک پرچہ اس علم کی مسلمانوں کے ہاتھوں پرورش کی تاریخ پر بھی مشتمل ہوتا تھا۔ یعنی فلسفۂ اسلامی، اسلامی ریاضیات، اسلامی سیاسیات، اور اسلامی اقتصادیات۔ اور جغرافیہ میں "جغرافیۂ عالمِ اسلام" کا ایک مزید پرچہ شامل ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ — فاضل — کے درجہ میں فاضلِ عقلیات، فاضلِ دینیات، سُنّی/شیعہ، اور فاضلِ ادبیات یہ تین اختیارات دیئے گئے تھے؛ اور علامہ کے درجہ میں تفسیر، حدیث، اور فقہ تین علوم کے اختیارات تھے۔

مجموعی حیثیت سے یہ اب تک کی ساری کوششوں میں سب سے زیادہ مفید، کارآمد اور اہم کوشش تھی۔

ــه علیم صاحب نے اپنی گفتگو میں اس کا حوالہ دیا تھا۔ کمیٹی کا مرتب کردہ نصاب کا کیا بچہ؟ حسنِ اتفاق سے مدرسۂ عالیہ رام پور میں محفوظ رہ گیا، اسلئے خود حضور کی تلخیص پیش کی رہی ہے۔

سید مناظر احسن گیلانی مرحوم

"دنیا میں ایسی قومیں بہت کم ہوں گی جن میں تعلیم اس قدر عام ہے جس قدر کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں۔ ان میں جو کوئی بیس روپیہ ماہوار کا متصدی ہوتا ہے وہ اپنے لڑکوں کو اس طرح تعلیم دیتا ہے جس طرح ایک وزیر اعظم اپنی اولاد کو۔"

یہ جنرل سلیمن کی رائے ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب حق کی کتاب . . . . .

کے دیباچے میں نے مذکورہ بالا فقرہ نقل کیا ہے۔ وہ جنرل موصوف کا تعارف ان الفاظ میں کراتے ہیں:

"ٹھگی کے انسداد کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں اور جنھیں ہندوستانیوں کے ساتھ ملنے جلنے کا اتفاق عام یوروپین افسروں سے زیادہ ہوتا رہتا ہے۔"

اسی ملنے جلنے اور قریب سے دیکھنے کا یہ اثر ہے کہ تعلیمی ذوق میں بیس روپیہ ماہوار پانے والا ہندوستانی مسلمان ان کو انگلستان کے وزیر اعظم کا ہم رتبہ نظر آتا ہے۔ جنرل مذکور نے اس کے بعد لکھا ہے:

"جو علوم ہمارے بچے لاطینی اور یونانی زبانوں میں اپنے کالجوں میں حاصل کرتے ہیں، وہی یہ لوگ (ہندوستانی مسلمانوں کے بچے) عربی اور فارسی میں سیکھتے ہیں۔"

بیان ان ہی الفاظ میں ختم نہیں ہو جاتا ہے، آگے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، میں نہیں

جانتا کہ ایک انگریز مبصر کے ان الفاظ کو سن کر ان بیچاروں کا کیا حال ہوا ہوگا جنھوں نے ہزار ہا ہزار روپے خرچ کر کے اپنے ناموں کے پیچھے آج ہندوستان میں آکسن اور کینٹب کے لاحقوں کے استعمال کا حق حاصل کیا ہے۔ جنرل سلیمن لکھتے ہیں:

"سات سال کے درس (یعنی درجہ فضیلت) کے بعد ایک (ہندوستانی) طالب علم اپنے سر پر جو آکسفورڈ کے فارغ التحصیل طالب علم کی طرح علم سے بھرا ہوتا ہے، دستار فضیلت باندھتا ہے، اور اسی طرح روانی سے سقراط، ارسطو، افلاطون، بقراط، جالینوس، اور بوعلی سینا پر

گفتگو کر سکتا ہے، جس طرح اکسفورڈ کا طالب علم"۔

دیباچہ: ۱۴

شیخ صاحب نے اسی جنرل کی کتاب کی دوسری جگہ سے یہ فقرے بھی نقل کیے ہیں:

"ایک تعلیم یافتہ مسلمان (یعنی وہی جس کا نام ملا، مولوی وغیرہ ہے) فلسفہ اور ادبیات اور دوسرے علوم وفنون پر قابلیت سے گفتگو کر سکتا ہے"

آخر میں بالکل صحیح حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

"اور بالعموم ان مضامین پر گفتگو کرنے اور موجودہ زمانہ میں جو ان میں تبدیلیاں ہوئی ہیں انھیں سمجھنے کا بہت خواہشمند رہتا ہے"

یہ واقعہ ہے کہ اگر دینی تعلیم کے نظام کو دنیوی تعلیم کے اداروں سے الگ نہ کر دیا جاتا، تو تعلیم کی دنیا میں یہ نوبت نہ پیدا ہوتی، بلکہ دینی عناصر کو باقی رکھتے ہوئے وہی فقہ، حدیث وتفسیر کی تینوں کتابوں کو قائم رکھتے ہوئے بتدریج عقلی، اور ذہنی علوم میں اسی قسم کی تبدیلیوں سے کام لیا جاتا، جس طرح مسلمان ہزار بارہ سو سال سے کام لے رہے تھے، تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ تعلیم کا جو نظام ہندوستان میں جاری تھا، وہ تمام عصری ترمیموں کو علم کی تمام شاخوں میں جذب نہ کر لیتا۔ جنرل موصوف نے بالکل تجربہ کی بات لکھی ہے کہ:

"موجودہ زمانہ میں جو ان میں تبدیلیاں ہوئی ہیں، انھیں سمجھنے کا بہت خواہش مند ہوتا ہے"

لوگوں کو معلوم نہیں ہے کہ مغرب کے جدید نظریات سے ہندوستان جب شروع شروع میں روشناس ہوا ہے اس وقت اس کے چرچوں سے مسلمانوں کے مدارس جس طرح گونج رہے تھے، شاید یہ کیفیت ان تعلیم گاہوں میں بھی اب تک پیدا نہیں ہوئی ہے، جہاں ان کی مستقل تعلیم دی جاتی ہے۔ زمین کی گردش، آسمانوں کے جرمی وجود سے انکار، بطلیموسی نظام کی جگہ شمسی نظام پر علم ہیئت کی بنیاد آج تو ان کے تذکرے کبھی کبھی سننے میں بھی آتے ہیں، لیکن پرانے مدرسوں میں بحث ومباحثوں کے جو سلسلے ان مسائل کے متعلق جاری تھے، اس کا اندازہ کچھ ان ہی لوگوں کو ہو سکتا ہے، جنھوں نے اس زمانہ کو دیکھا تھا، مختلف کتابیں ریاضی کی جو اس زمانہ میں لکھی گئی ہیں

جن میں سب سے ضخیم کتاب فارسی زبان میں جامع بہادر خانی ہے، جو تین فنون دہیئت، حساب، علم المرایا والمناظر، پر مشتمل ہے؛ آپ کو جگہ جگہ اس کتاب میں ان جدید نظریات کا ذکر تفصیل سے ملے گا، جو اس وقت تک یورپ میں مختلف مسائل کے متعلق پیدا ہو چکے تھے۔

عربی زبان میں علامہ تفضل حسین خاں نے مختلف کتابیں علوم ہندسیہ کے متعلق لکھیں، جن میں حکماء یورپ کے خیالات کا تذکرہ تائید کے ساتھ کیا گیا تھا۔

ان ہی پرانے طرز کے مولویوں کو دلی کے عربک کالج کے زیر اثر جدید علوم وفنون سے روشناسی کے جو مواقع ملے تھے، کاش ان میں تھوڑی سی وسعت برتی جاتی تو ہندوستان کے علم کی دنیا اور ہوتی، حیدرآباد میں جس شاندار طریقے سے علوم جدید کا استقبال قدیم مذاق کے امراء اور علماء نے کیا تھا، اس کا اندازہ آپ کو شمس الامراء بہادر کی دارالاشاعت کی کتابوں اور ان کے مدرسہ فخریہ کے نصاب سے ہو سکتا ہے۔

ایک صدی پہلے طبیعیات و ریاضیات میں شمس الامراء مرحوم اول وثانی نے اردو زبان میں مختلف کتابیں تصنیف کرائیں۔ خود پریس قائم کر کے ان کو شائع کیا۔ یہ بہرحال ہندوستان میں کام کی ابتدا ہو چکی تھی، کہ بعض فاسد اغراض کے تحت حکومت کو غلط مشورہ دیا گیا، اور اس کے بعد جو ہونا تھا سو ہوا!

غریب مولویوں کو بدنام کیا گیا، ان پر جھوٹے الزام تراشے گئے جن میں سب سے بڑا افترائی الزام انگریزی زبان کے سیکھنے کی حرمت کا فتویٰ تھا۔[1]

---

[1] حالاں کہ معاملہ بالعکس ہے، شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق تو خیر سر سید احمد خاں وغیرہ نے نقل کیا ہے کہ انھوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کا فتویٰ دیا تھا، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے فتاوی عزیزیہ میں ایسا کوئی فتویٰ تعیینًا یا نفیًا یا اثباتًا نہیں ہے مگر شاہ صاحب کے سوا دوسرے علماء مثلاً حضرت مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کے فتاوی میں دیکھیے، ایک جگہ نہیں متعدد مقامات میں آپ کو جواز کا فتویٰ ملے گا، ایک موقع پر ارقام فرماتے ہیں:-

"فی الواقعہ نفس تعلیم انگریزی کا شرعاً ممنوع نہیں ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابتؓ کو زبان یہود سیکھنے کا حکم دیا، جیسا کہ جامع ترمذی وغیرہ میں مروی ہے۔

ملا علی قاری مکی کی شرح مشکوٰۃ میں ہے: لا یعرف فی الشرع تحریم علم لغۃ من اللغات سریانیۃ

کانت او عبرانیۃ، ھندیہ کانت، او ترکیۃ او فارسیۃ کانت او غیرھا۔ یعنی شریعت میں کسی لغت کے سیکھنے کو حرام قرار دیا گیا ہو ایسی بات کسی دلیل سے معلوم نہیں ہوتی خواہ لغت سریانی ہو یا عبرانی، ہندی ہو یا ترکی یا فارسی وغیرہ ہو کوئی ہو۔" مجموعہ فتاوی مولانا عبدالحئی مرحوم ص ۳۰ ج ۱

اور لطف یہ ہے کہ پھیلانے والوں نے ایک بات پھیلا دی۔ تقریباً ایک صدی سے وہی رٹا یا ہوا سبق رٹا جا رہا ہے، اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگ بغیر کسی شرم و حیا کے علانیہ کوچہ و بازار میں اسی سبق کو دہرائے چلے جا رہے ہیں اور کوئی نہیں پوچھتا کہ آخر یہ فتویٰ کس کتاب میں ہے، کس مولوی نے، کب، کہاں، کس بنیاد پر کس کو یہ فتویٰ دیا تھا، انیسویں صدی کے علماء کے فتووں کی کتابیں چھپی ہوئی ہیں، ان میں ڈھونڈا جاتا۔ لیکن اتنی فرصت کس کو ہے "دیوانہ گفت وابلہ باور کرد" کی مثال اس سے زیادہ شاید ہی کسی چیز پر کبھی صادق آئی ہو۔ مولویوں نے جو کچھ کہا تھا وہ صرف یہ تھا کہ ہمارے تعلیم کے نظام کو نہ توڑا جائے، اس کی قدر و قیمت نہ گھٹائی جائے۔ لیکن جو چیزیں نہیں تھی اس میں بھی وہ کسی ترمیم کے قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے، یہ کس نے کہا؟ جس قوم نے اسی یورپ کے ایک حصہ یونان کے سارے علوم پر قبضہ اور ایسا قبضہ کر لیا کہ آئندہ دنیا کو یونانیوں کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہوا، مسلمانوں ہی کے ذریعہ سے معلوم ہوا ——————
—— کیا اسی یورپ کے علوم سیکھنے سکھانے سے وہ محض اس لئے انکار کر سکتے تھے کہ وہ یورپ کے علوم و فنون ہیں۔ لیکن اپنے آپ کو فانی کر کے محض دوسروں کے ساتھ باقی رہنے سے ان کو انکار تھا۔ خود ہی سوچا جا سکتا ہے کہ یہ انکار ان کا کس حد تک بیجا تھا۔

اگر تعلیم معلومات کی گرداوری کا نام ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ فنون میں سے کسی ایک فن کے لئے بھی طالب علم کی پوری عمر وفا کر سکتی ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کسی ایک فن کی دو تین کتابوں کو درساً درساً پڑھتے ہوئے لحد تک پہنچ جائے گا، بشرطیکہ مہد ہی سے اس نے پڑھنا شروع کیا ہو۔ لیکن اگر تعلیم کا وہی مقصد ہے جس کا میں نے شروع میں ذکر کیا، یعنی نہ جانی ہوئی چیزوں کو جاننے کی انسان میں جو قدرتی صلاحیت ہے، اس صلاحیت کو ابھارا جائے۔ طلبہ میں ایک ایسی استعداد اور اس کا راسخ ملکہ پیدا کیا جائے۔ تعلیمی زندگی

سے الگ ہونے کے بعد اپنے متعلقہ فنون کے حقائق و مسائل تک استاد کی اعانت کے بغیر اس کی رسائی ہونے لگے، خود سوچنے کی اور دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کے سمجھنے کی

خواہ وہ کسی قسم کی پیچیدہ اور دقیق تعبیر میں پیش کی گئی ہوں تنقید یا صحیح کو غلط سے جدا کرنے کی صلاحیتوں کو مدد دے کر باہر نکلے۔ اگر پڑھنے پڑھانے کا یہی مطلب ہے' دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ چیزوں کو دکھانے پر زیادہ زور دینا مقصود نہ ہو' بلکہ دیکھنے کی قوت بڑھائی جائے' جہاں تک بڑھ سکتی ہو' تعلیم صرف اس کا نام ہو' اور دیکھنے' سیر کرنے کا کام تعلیم کے بعد کیا جائے' تو میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے بزرگوں نے اسلامی علوم کی تعلیم کی جو راہ بنائی تھی' اس سے بہتر راہ اور کیا ہو سکتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جیسا کہ آپ سن چکے ہیں کہ عربی تعلیم مدارج کے لحاظ سے دو درجوں میں تقسیم تھی' ایک ضرورت کا درجہ تھا' دوسرا افضل کا' ضرورت کے درجہ تک مذہب کی تعلیم حاصل کر کے جو تعلیم کو ختم کر دینا چاہتے تھے' ان کی غرض فقط یہ ہوتی تھی کہ اپنی شخصی زندگی میں معمولی مذہبی اور دینی ضرورتیں جو ان کو پیش آئیں گی' ان ضرورتوں کی حد تک دین کے سمجھنے کی ان میں لیاقت پیدا ہو جائے' اس کے لئے صرف و نحو کی معمولی ابتدائی تعلیم کے بعد قدوری وغیرہ جیسی فقہی متن کی کوئی کتاب پڑھا دی جاتی تھی اور یہ اتنا مختصر نصاب ہوتا تھا کہ کوشش کرنے والے چاہتے تو چھ مہینوں میں اسے ختم کر سکتے تھے'

حضرت سراج عثمان رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں مولانا فخر الدین زرادی ......

...... نے ذمہ داری لی تھی کہ چھ مہینے میں قدر ضروری والے علم تک پہنچا دوں گا'

اور جو انھوں نے وعدہ کیا تھا' پورا کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ذاتی ضرورتوں کے لئے مذہب کی اتنی تعلیم کافی نہ تھی۔

میں اسلامی مدارس کو انگریزی مدارس نہیں بلکہ انگریزی مدارس کو چاہتا ہوں کہ مسلمان بنا لیا جائے۔ رہے عربی مدارس: عام عربی مدارس کو ہائی اسکولوں

میں تبدیل کر دیا جائے جن میں دینیات کی تعلیم میں صرف قرآن ہو' بڑے مراکز کو علوم کی تکمیل کے لیے کر لیا جائے۔ مثلاً تفسیر کے لئے ندوہ' حدیث کیلئے دیوبند فقہ کے لئے فرنگی محل کوئی ادارہ' اور کلام و تصوف کے لیے اجمیر میں کوئی انتظام کر دیا جائے۔

قدیم نصاب میں دینیات کے مضامین (قرآن' حدیث' فقہ) محوری اور اساسی قرار دے کر درس کے لئے ہر مضمون کی ایک ایک ٹھوس' جامع' حاوی مختصر

کتاب کا انتخاب کر کے دینیات کے لیے پورے نصاب میں (مشکوٰۃ، ہدایہ اور وقایہ) صرف تین کتابوں کو کافی قرار دیا گیا اور اس کے بعد پڑھنے والوں کے لئے ایک وسیع میدان چھوڑ دیا گیا، جس میں جب ضرورت تھی تو فارسی کی نظم و نثر کی بیسیوں کتابوں کی کھپتی زندگی میں اور منطق، فلسفہ، ریاضی، ہندسہ، اصول کلام، ادب عربی کی تقریباً ساٹھ ستر کتابوں کی اعلیٰ عربی تعلیم میں کافی گنجائش نکل آئی، پھر جب تک موقع تھا ان غیر دینیاتی مضامین کی حیثیت اختیاری مضامین کی رہی، اور جیسے جیسے زمانے کا مطالبہ بڑھتا گیا، ان مضامین میں سے جن کو لازم قرار دینے کی حاجت ہوئی، انھیں لازم قرار دے دیا گیا اور یونہی مسلمانوں کے اس واحد تعلیمی نظام سے منطقی ملا، فلسفی ملا، ہندسی ملا، ادیب ملا، شاعر ملا الغرض باوجود ملا ہونے کے جس جس چیز کی ضرورت تھی، وہی بن بن کر نکلتے رہے۔

کیا بہ سہولت تمام آج بھی بزرگوں کے اسی تعلیمی منہاج کو سامنے رکھ کر ہم حقیقی اور خالص دینیات کے ان اساسی مضامین کی انہی تین کتابوں کو باقی رکھتے ہوئے وہی فارسی جو کچھ دن پہلے ہندوستان کی حکومت کی زبان تھی، اور وہی معقولات جن کی مغل دربار میں قیمت ملتی تھی بجائے ان غیر دینیاتی مضامین کے عصر حاضر میں حکومت کی جو زبان ہے اور موجودہ حکومت جن علوم و فنون کے پڑھنے والوں کا اپنی ضرورتوں کے لئے مطالبہ کر رہی ہے، ہم زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے ٹھیک اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر اپنے نصاب میں ان جدید مضامین کو شریک کر کے بجائے فلسفی ملا کے سائنٹسٹ ملا، اور بجائے منطقی ملا کے

سائکلوجسٹ ملا وغیرہ ملاؤں کی مختلف قسم نہیں پیدا کر سکتے؟

ملائیت کہئے یا دینی علوم ان کے لئے جب صدہا سال تک وہی تین کتابیں کافی سمجھی گئیں، تو پھر آج بھی اسی ملائیت کے لئے، یا ایک دینی عالم ہونے کے لئے یہی تین کتابیں کیوں کافی نہ ہوں گی۔

میں نہیں سمجھتا کہ اگر اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم کی جو مدت اس وقت مقرر ہے یعنی بی۔ اے ہونے کے لئے کم از کم چودہ سال کی تعلیم ضروری ہے، اس چودہ سال کے نصاب میں دینیات کی ان تین کتابوں (قرآن، مشکوٰۃ، ہدایہ و وقایہ) کی جگہ نہیں نکل سکتی۔

اور بالفرض ضروری، غیر ضروری مضامین کی اسکولوں اور کالجوں میں جو کثرت ہے یعنی وہ مضامین بھی پڑھائے جاتے ہیں جو استاد کے بغیر طلباء کو نہیں آسکتے، اور ان مضمونوں کو بھی پڑھایا جاتا ہے جنھیں استادوں کے بغیر اونی ہر پڑھا لکھا آدمی پڑھ سکتا ہے اور پڑھتا ہے، اگر بدتمیزی کے اس طوفان میں ان تین کتابوں کے لئے جگہ نہ نکل سکتی ہو تو کیوں نہیں ہم اپنے سارے دینی اور دنیاوی تعلیمی نظام کو بجائے دوئی کے وحدت کے رنگ میں ڈھال لیں، اور اپنا نصاب خود بنائیں تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ بزرگوں کے اس عجیب و غریب نمونے پر جب سے مجھے تنبہ ہوا ہے، یعنی دینیات کی کل تین کتابوں کے سوا ملائیت کا سارا میدان غیر دینیاتی کتابوں سے بھرا ہوا جو محسوس ہوا تو حقیقت یہ ہے کہ اسی وقت سے میں اپنے اندر اس یقین کو پاتا ہوں کہ اسی میدان کو قدیم مطالبے والے غیر دینی علوم کو نکال کر بآسانی موجودہ مطالبوں کے مطابق والے مضامین کے لئے پوری قوت اور کافی وسعت دلی کے ساتھ ہم جگہ نکال سکتے ہیں۔ مثلاً میں آپ کے سامنے ابن سینا کے تعلیمی نصاب کا ایک حصہ ابن خلکان سے نقل

کرتا ہوں اگر اسی نمونے کو سامنے رکھ لیا جائے اور ابتدائی تعلیم کی بنیاد اسی نمونہ پر رکھی جائے۔

ابن خلکان نے لکھا تھا کہ:

"دس سال کی عمر تک ابن سینا نے قرآن عزیز اور ادب پڑھا، کچھ عقائد کے مسائل یاد کئے۔ حساب الہند و جبر و مقابلہ سیکھا۔"

حساب الہند سے وہی ہندوستان کے علم حساب کا قدیم طریقہ مراد ہے، جس میں پہاڑے وغیرہ یاد کرا کے آئندہ جمع، تفریق، تقسیم اور اس کی مختلف قسمیں سکھائی جاتی ہیں۔ آج کل کا نام "میتھیمیٹکس" ہے، ممکن ہے ان سارے مضامین کے لئے دس سال کی عمر آج ناکافی ہو، اور ہے بھی یہی بات کہ ابن سینا کو ہر بچہ پہ قیاس کرنا بھی غلط ہے۔ اب بجائے دس کے وہی سولہ سال کی عمر رکھ لیجئے، جو کہ آج میٹرک پاس کرنے کی ابتدائی عمر ہے۔ یعنی اس عمر سے کمسن بچوں کو میٹرک کے امتحان میں بیٹھنے نہیں دیا جاتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ابتدائی مکتبی تعلیم کے نصاب میں حسب ذیل امور کو مد نظر رکھ لیا جائے:

(۱) صرف وہی چیزیں پڑھائی جائیں جو استادوں سے پڑھے بغیر نہیں سیکھی جا سکتیں۔

(۲) اُردو میں ترقی کرنے کے لئے اُردو ہی کتابوں کا مسلسل سالہا سال تک پڑھے چلے جانا کوئی مفید نتیجہ پیدا کرتا، بلکہ اُردو میں قوت پیدا کرنے کے لئے فارسی اور فارسی میں بچوں کو قوی کرنے کے لئے عربی سکھانا ضروری قرار دیا جائے۔

(۳) عربی زبان کے صرف اُسی حصے کو مسلمانوں کے لئے ضروری سمجھا جائے جس میں ان کی دینی معلومات ہیں۔ باقی عربی کے دوسرے حصے کو اعلیٰ تعلیم میں بطور اختیاری مضامین کے چاہا جائے تو رکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس کے اختصاصی علما رجی اختصاصی درجوں میں اگر پیدا کئے جائیں تو وہ ایک دوسری ضرورت ہے، لیکن ہر پڑھے لکھے مسلمان کو جس عربی کی حاجت ہے، وہ صرف اسلامی ادبیات والی ہی عربی ہے۔

(۴) اس عربی کو قصہ کہانی کی کتابوں ہی کے ذریعہ سکھانے کی جگہ خود قرآنی پاروں اور فقہی و حدیثی متون کے ذریعہ سے سکھانا زیادہ مفید اور ضروری ہے کہ یہ یک کرشمہ دو کار ہے۔

(۵) اسلامی ادبیات والی عربی کے لئے نحوی و صرفی قواعد کے ان طول طویل سلسلوں کی حاجت نہیں جو کسی زمانہ میں دماغی تمرین اور ذہنی تشحیذ کے لئے پڑھائے جاتے تھے۔

ان پنجگانہ اصول کو پیش نظر رکھ کر اگر نصاب بنایا جائے تو میں نہیں سمجھتا کہ نو سال میں میٹرک تک کی انگریزی و حساب کے ساتھ بچوں کے اندر اس کی صلاحیت کیوں نہ پیدا ہو جائے گی کہ آئندہ کلیاتی تعلیم کے نصاب میں قرآن و حدیث و فقہ کی ان [illegible] کتابوں کو بی۔ اے تک کے چار سال میں دوسرے اختیاری متناسب مضامین کے ساتھ پڑھ کر ختم کر دیں جو قدیم درس نظامیہ میں دینیات کی آخری درسی کتابیں ہیں۔ تجربہ بتائے گا کہ انگریزی ادب اور جدید علوم میں سے متناسب علوم کا کوئی گروپ (طائفہ)، درس نظامیہ کے ان تینوں دینیاتی کتابوں کے ساتھ بخوشی جمع ہو سکتے ہیں، پھر جیسا کہ میں نے عرض کیا بی۔ اے کے بعد ایم۔ اے کے اختصاصی درجہ میں اپنی اپنی مناسبت کے لحاظ سے طلبہ جس فن میں خصوصیت پیدا کرنا چاہیں، پیدا

کر سکتے ہیں۔ ان خصوصی فنون میں جہاں جدید علوم و فنون میں سے کسی فن و علم و زبان وغیرہ کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ وہیں بآسانی فقہ و حدیث، تفسیر، ادب عربی، بلکہ جی چاہے تو کوئی قدیم معقولات منطق، کلام، فلسفہ، اصول وغیرہ کے مضامین بھی اختیار کر سکتا ہے، یہ ایسا نصاب ہوگا جو طلبہ کے لئے قدیم و جدید علوم و السنہ میں سے ہر ایک کے اندر خصوصیت پیدا کرنے کا ذریعہ فراہم کرتا ہے۔ اور سب سے اہم اصولی نفع نظام تعلیم کی اس وحدت کا وہی ہے کہ ملا و مسٹر، علماء و لیڈر کی باہمی کشمکش کا سارا قصہ ختم ہو جاتا ہے، اب جو بھی ملک میں پڑھا لکھا یا صاحب علم و فضل ہوگا، وہ پہلے ملا ہوگا اس کے بعد جس مضمون کو اختیار کیا ہوگا اس کا ماہر قرار پائے گا۔ انشاء اللہ اس کے بعد ملا ہی مسٹر ہوں گے اور مسٹر ہی ملا ہوں گے، علماء ہی لیڈر ہوں گے۔ اور لیڈر ہی علماء ہوں گے۔ جیسا کہ بارہ ساڑھے بارہ سو سال تک، یعنی نظام تعلیم کی ثنویت (دوئی) سے پہلے مسلمانوں میں عموماً یہی ہوتا رہا۔ ابن رشد ارسطو کی کتابوں کی شرح بھی کرتا تھا، اور اسی کے قلم کی علم فقہ میں وہ قیمتی یادگار ہے جس کا نام بدایۃ المجتہد ہے۔ فقہ کے ہر باب میں آئمہ امصار و مجتہدین امام ابوحنیفہ، شافعی، مالک، احمد وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم کے مسالک پر قرآن و حدیث و آثار صحابہ کی روشنی میں اتنی اچھی بحثیں کی ہیں کہ مشکل ہے اس جوڑ کی کوئی کتاب فقہ جامع میں مل سکتی ہے۔ امام رازی ابن سینا کے فلسفہ کی تشریح بھی کرتے تھے، اور وہی قرآن کی معرکۃ الآراء تفسیر بھی کر گئے ہیں، جو تفسیر کبیر کے نام سے امت میں مشہور ہے۔ نہ صرف علماء اہل سنت بلکہ شیعی علماء کا بھی یہی حال ہے، میر باقر داماد فلسفہ کے میدان کا یکہ تاز سمجھا جاتا ہے لیکن کون باور کر سکتا ہے کہ جس نے "الافق المبین" جیسی پیچیدہ الٰہیاتی کتاب لکھی ہے وہی "شارع النجاۃ" نامی کتاب فقہ شیعی کی بھی لکھ سکتا ہے، وہی شیعوں کی حدیث کی مشہور کتاب الکافی پر حاشیہ نگاری کا کام کر سکتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے زمانہ میں دینی اور دنیوی علوم کے مرکب نصاب کو جاری کر کے تعلیمی نظام میں ایسی وحدت پیدا کر دی تھی کہ اسی ہندوستان میں ایک زمانہ وہ بھی گزرا ہے کہ غیر مذہب کا آدمی بھی پڑھنا چاہتا تھا، تو اسے بھی اسی نصاب کی کتابیں پڑھنی پڑتی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حکیم کامران، دستور، ہیر بد وغیرہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نے اسلامی علماء سے درسی کتابیں پڑھیں۔ حکیم کامران اکثر کتابوں کا درس بھی دیتا تھا۔ ان کے سوا اس ملک کے ہندو بھی جیسا کہ معلوم ہوتا ہے مسلمانوں ہی کی طرح عربی نصاب کو ختم کرتے تھے، بداؤنی

نے عہد سکندری کے ایک برہمن کا ذکر کیا ہے۔

"یکے از شعراء عہد سکندر لودی برہمن بود می گویند کہ باوجود کفر علوم رسمی را درس می گفت" (ج ۱ ص ۳۲۴)

حالاں کہ سکندری عہد میں گو دینیاتی کتابوں کے ساتھ معقولاتی عناصر کا اضافہ ہونا شروع ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی اتنا اضافہ تو قطعاً نہ ہوا تھا جتنا کہ فتح اللہ شیرازی اور ان کے بعد ہوا۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ اس زمانہ میں "علوم رسمی" کی کتابیں جو پڑھاتا ہوگا، کیا وہ بزودی اور ہدایہ وغیرہ نہ پڑھاتا ہوگا۔ آخر جب حکیم کامران سے مسلمان طلبہ تفسیر بیضاوی پڑھتے تھے تو کیا تعجب ہے کہ مسلمانوں کے "علوم رسمیہ" کا یہ پڑھانے والا برہمن ان کتابوں کو نہ پڑھاتا ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ بزرگوں سے دینیات کا جو کورس بطور متروکہ کے ہم تک پہنچا ہے، وہ اتنا مختصر اور چند گنی چنی کتابوں پر مشتمل ہے کہ ہر عہد اور ہر زمانہ کے تعلیمی نظام میں اس عہد کے مروجہ علوم و فنون کی کتابوں کو ہم ان کے ساتھ جوڑ سکتے ہیں اور ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک ہم نے ان کو غیر دینی علوم کے ساتھ جوڑے رکھا۔ اسی بنیاد پر میرے نزدیک دین کی تعلیم کے لئے کسی مستقل جداگانہ نظام کو قائم کرکے مسلمانوں میں علمی انتشار اور دو عملی پیدا کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ دینیات کے اسی نصاب کے ساتھ جب مغلئی عہد کے درباری علوم و فنون، منطق و فلسفہ، ریاضی، فارسی ادب کے نثر و نظم وغیرہ کی کتابوں کو جوڑ کر ہم نے تعلیمی نظام کی وحدت کو پوری قوت کے ساتھ باقی رکھا، کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ آج دینیات کے اسی مختصر کورس کو محور بنا کر عہد حاضر کے ٹکسالی علوم و فنون یا زبانوں کی تعلیم کو اس کے گرد ہم گردش نہیں دے سکتے۔ جوں ہی کہ زمانہ بدلا تھا، بزرگوں کے اس نمونے کو پیش نظر رکھ کر دینیات کے محور کو قائم رکھتے ہوئے ذیلی مضامین کو ترک کر دیا جاتا۔ یا یہ نا بھی کیا جاتا تو مغلیات کو بھی اختیاری مضامین کا ایک گروپ قرار دیکر عصریاتی علوم کا بھی نصاب میں اضافہ کر دیا جاتا، کاش ایسا ہو جاتا تو آج بدتمیزی کے جس طوفان میں مسلمان ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، غالباً یہ صورت پیش نہ آتی، ولکن ماقدر اللہ فسوف یکون۔

لیکن وقت اب بھی باقی ہے۔ تعلیم کی اس ثنویت، اور دو عملی کو اب بھی

توڑا جا سکتا ہے اور توحیدی نظام کو اب بھی اس کی جگہ جاری کیا جا سکتا ہے۔ لوگ مصارف کے سوال کو درمیان میں لاتے ہیں۔ حالانکہ اولاً یہ حکومت ہی کا فرض تھا جہاں دُنیوی علوم وفنون پر وہ کروڑہا کروڑ صرف کر رہی ہے، ہر صوبہ میں کچھ رقم دینی علوم کے معلمین کی تنخواہوں کے لئے بھی منظور کر سکتی ہے، اور اب تو تقریباً تمام صوبوں میں مشرقی تعلیم و امتحان کے نام سے سرکاری مصارف سے ادارے جاری ہو چکے ہیں۔ اور فرض کیجئے کہ اگر حکومت اس پر بھی راضی نہ ہو تو مسلمان اس رقم کو جو آج وہ ان تعلیم گاہوں پر صرف کر رہے ہیں جن میں اُن کی دینیات کے ساتھ مغلئی عہد کے السنہ و علوم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اسی رقم کو حکومت کی جامعات و یونی ورسٹیوں کے حوالے کر کے اپنی تعلیم میں وحدت پیدا کر سکتے ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ہر ہر صوبہ میں مسلمانوں کے جو اوقاف ہیں، حکومت اگر چاہے یا مسلمان حکومت پر زور دے کر اس چاہے پر اس کو مجبور کریں تو اوقاف کی اس مدد سے ... اسکولوں اور کالجوں میں دینیات کے قدیم نصاب کو جاری کر کے ثنویت کی اس لعنت سے مسلمانوں کو نجات مل سکتی ہے۔

ملہ "ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت" کے جلیل القدر مصنف مولانا گیلانی بہار کے ازلی زاد عالم دین تھے جو گزرے ہوئے زمانہ کے علما کی یاد تازہ کر دیتے تھے۔ انکا اہم

امتیاز علی عرشی[1]

پہلے انھیں تعلیم گاہوں کے نکلے ہوئے فاضل مختلف عہدوں پر کام کرتے تھے، وہ بات تو اب جاتی رہی کہ قاضی بھی ہو سکے، مفتی بھی ہو سکے۔ اب یہ اسلامی تعلیم والے دُنیا کی زندگی سے واقف نہیں؛ اور دوسرے طریقہ کے پڑھنے والے دین کے بارے میں نہیں جانتے۔ ہمارے یہاں دورنگی تعلیم کا یہ سلسلہ پہلے نہیں تھا۔ اب تو گویا دو الگ طبقے بن گئے ہیں۔ اس میں خالص نئی تعلیم والوں کو یہ نقصان پہنچا کہ قدیم درسگاہوں سے نکلے ہوؤں کو انھوں نے حقیر سمجھا، تو جن فنون کے اندر وہ واقعی استعداد رکھتے تھے، اُن سے بھی فائدہ نہیں اُٹھایا جا سکا؛ اور ان لوگوں کو یہ نقصان پہنچا کہ جو کچھ وہ پڑھتے پڑھاتے آرہے تھے، انھوں نے اسی کو آخری حرف سمجھ کر اکتفا کر لیا؛ اب یہ نہیں سوچا کہ وحی آنے کی تو اب گنجائش ہی نہیں رہی ہے، اب تو خود ہی پچھلوں کی دی ہوئی روشنی میں آگے بڑھنا ہوگا، اور یہ طے کرنا ہوگا کہ ان علوم کو چھوڑنا چاہیے، اور ان علوم کو پڑھنا چاہیے۔

مثلاً ہمارے یہاں پرانی تعلیم ہے کہ زمین ساکن ہے۔ مولانا آزاد کے والد نے ایک رسالہ اسی سلسلہ میں لکھا تھا، اس میں حرکتِ زمین کے ابطال کے لیے تین سو دلیلیں ہیں۔ حتیٰ کہ شروع میں سرسید نے بھی اس موضوع پر ایک رسالہ حرکت ابطال ثابت کرنے کے لیے لکھ ڈالا تھا، لیکن یہ سب کچھ اب داستانِ پارینہ ہوگئی، یا نہیں؟ تو ضرورت تھی اس کی کہ جائزہ لیتے کہ کن فنون کی ضرورت ہے۔ ان میں سے کچھ کام کے بھی نکل آتے۔

نئے نئے مسائل پیدا ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اب یہ خلا میں انسان کے جانے سے روزے کے بارے میں، نماز کی سمت کے بارے میں، اور کتنے ہی مسائل ہیں، اگر وہاں کی مخلوق کو ضرورت ہے اجتہاد کی، تو اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے۔ یہ جائزہ لینے کے بعد کہ کس طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے، اس کی طرف زیادہ توجہ دی جائے؛ اور جس کی طرف کم توجہ دینے کی ضرورت ہے، اُدھر کم توجہ دی جائے۔ اور یہ جو علوم غیر دینی ہیں، ان میں سے اپنے یہاں جو علوم پڑھاتے چلے آرہے

لہ کم لوگ جانتے ہیں کہ غالباً بھوپال کے ماہر دینی صاحب تفسیر نوری کے مرتب ہیں؟ علومِ اسلامیہ پر ان کی بڑی گہری نظر ہے! اور اسلامی مسائل پر سوچتے رہتے ہیں۔

ہیں (جن کو دینی کہتے ہیں!) ان کو تاریخی حیثیت دے دی جائے؛ موجودہ تحقیقات کے اعتبار سے ان کو پڑھانا ہوگا۔

اور سب سے بڑی ضرورت تو اس کی ہے کہ ——— جیسے کہ فخرالدین رازی کے زمانے تک جو علم کلام ہوتا تھا، اس میں اپنے زمانے کے مسائل سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی رہی، تو نیا علم کلام پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ میں ایک مثال دیتا ہوں:

میری دانست میں قرآن پاک کے کسی بیان میں اور مسلّمہ حقائق میں کوئی تناقض نہیں ہے؛ کسی قسم کا! قرآن جس زمانہ میں نازل ہوا ہے، کچھ باتیں ایسی تھیں جو مسلّمہ قوم کا درجہ رکھتی تھیں، قرآن نے اپنی تعلیم پر عمل کرانے کے لیے جو تدبیریں اختیار کیں ان میں ان مسلّمات قوم کو بھی استعمال کیا اور دلیل میں پیش کیا۔ آج قرآن پاک نازل ہوتا تو اور انداز ہوتا اس کا۔ قرآن مجید میں لکھا ہوا ہے، کہ سات آسمان ہیں؛ اور کوئی پوچھے کہ سات آسمان آپ کیسے کہتے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن قرآن پاک کا مقصد ایسٹرونومی تھی اس کی توقع نہیں رکھنا چاہیے۔ وہ تو۔ یہ کہنا چاہتا تھا کہ خدائے تعالیٰ ہی زمین و آسمان سب کا بنانے والا ہے، وہ ایک ہے اور اسی کو سجدہ زیبا ہے ——— قرآن پاک کے اندر جو کچھ بیان کیا گیا ہے مگر ایک حقیقت نفس الامری ہے، اور ایک حقیقت مسلّمہ قوم ہے؛ قرآن پاک حقیقت قوم سے کام لے رہا ہے۔ اب یہ سمجھنا کہ وہ مسلمات قوم، مسلمات نفس الامری کا درجہ رکھتے ہیں، غلط ہے۔ اگر اُس زمانہ میں آج کے مسئلے اٹھا دیے جاتے تو وہ لوگ جو رسولؐ کو ویسے ہی دیوانہ کہتے تھے، کوئی سُننے کو تیار ہوتا یہ بات، کہ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ (وغیرہ)

ایک اور مثال دوں:

آپ نے دیکھا ہوگا، نماز پڑھ کے امام شمال کی طرف مُنہ کر کے بیٹھ جاتا ہے۔ ایک عزیز اس کی وجہ پوچھنے لگے تو انھیں بتایا گیا کہ ادھر مدینہ منورہ ہے۔ ایک دن انھوں نے مجھ سے پوچھا، میں نے کہا بھائی ادھر تو نینی تال ہے، ہمالیہ ہے تبت ہے، روس ہے، مدینہ ادھر کیسے ہوگیا۔ انھیں تعجب ہوا تو میں نے کہا نقشہ یوں

ہے: اب دیکھئے ہم یہاں رہتے ہیں، طے ہے یہ؟ میں نے کہا، مدینہ اور مکّہ کے درمیان تین سو میل کا فاصلہ ہے صرف؛ تو یہ تین ہزار یا چار ہزار میل پر جو آدمی کھڑا ہے اس کے لئے سمت یہی رہے گی نا؛ برابر ہی برابر میں ہوں گے وہ؛ مکہ اور مدینہ کا آپس میں جو فرق ہے وہ ٹھیک ہے یعنی مکہ سے شمال میں ہے مدینہ۔ اگر مکّہ میں کوئی آدمی ہو اور وہ یہ کہے کہ میں ادھر پیٹھ نہیں کرتا، تو وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ بات میں نے نقشہ بنا کے سمجھادی، یوں بھی سمجھادی۔ مگر انھوں نے دوسرے وقت مجھ سے کہا، کہنے لگے بھئی ٹھیک کہتے ہو، مگر نسبت جو شمال و جنوب کی ہے!

اب یہ ان کی نیکی تھی۔ ورنہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جغرافیہ نہ جاننے کا یہ سادہ فتویٰ تھا۔ اب ایک انگریزی داں کے اوپر کتنا برا اثر پڑے گا۔ اس واقعہ کا۔ اور وہ آئندہ کسی اعتبار سے بھی مولوی صاحب کی کوئی بات ماننے کا نہیں۔ اور یہ مسلمات میں سے ہے کہ جب تک دماغ مرعوب نہیں ہوتا، فرد کا فرد سے یا قوم کا قوم سے، اس وقت تک آپ کسی کو کسی بات کی جانب مائل نہیں کرسکتے۔ رعب اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب عربی کی تعلیم کے نظام میں خود منتہی کے درجہ پر ہوں تو وہ ان کو صحیح طور پر سمجھ سکیں؛ اور ہماری زندگی سے جن حقائق کا واسطہ ہے انھیں سمجھیں؛ اور پھر ان میں اگر کوئی اسلامی مسئلہ ان سے متعلق ہوتا ہے تو وہ ایک حل نکال سکیں۔ مختصر یہ کہ جیسے کہ سرسید نے اپنے زمانے میں ایک علم کلام پیدا کیا تھا، علم کلام پیدا کرنے کی اب ضرورت ہے، اور اس میں پچھلی باتوں کو جو غلط ثابت ہو چکی ہیں یہ ماننا ہے کہ غلط ہیں۔ رہا معاش اور معاد والا مسئلہ، تو اگر ان دونوں کو ملا دیا جائے اور اس طرح نصاب مرتب کیا جائے کہ اس میں یہ سب چیزیں ہوں تو میرے خیال میں ایسا مسئلہ کچھ نہیں۔ بھائی، یہ عربی علوم پڑھنے کے بعد ابن سینا پیدا ہو سکتا ہے، بیرونی پیدا ہو سکتا ہے، میں پیدا ہو سکتا ہوں ____ اس زمانے میں تفریق نہیں تھی علوم دینی اور غیر دینی کی، سب پڑھائے جاتے تھے۔

بات یوں ہے کہ مسلمان چاہتا یہ ہے کہ وہ مسلمان رہتے ہوئے معاش، اور معاد دونوں کا مسئلہ حل کرے۔ ہمارے یہاں دینی مزاج کے جو آدمی ہیں۔ وہاں یہ بات پیدا نہیں ہوتی؛ دیوبند میں بھی؛ جماعت اسلامی کی درسگاہوں سے نکلے ہوئے بعض لوگ ہیں جو نئے علوم سے بھی اچھی طرح سے واقف ہیں، ان کو

ن کی صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسجد کے امام ہیں یہ؟ لیکن اپنے فن میں
عبور ہے۔

ابھی تک جو کوششیں بھی ہوئیں بالآخر وہی معاشیات کا مسئلہ پیدا ہو جاتا
ھائیں گے کمائیں گے کیا۔ مگر کیا تجارت اور مزدوری کے سارے راستے بند
آپ جو معاشرہ بنانا چاہتے ہیں، اس میں خالی آپ کو سرکاری ملازم ہی تو نہیں
، اس میں آپ کو تاجر بھی چاہئیں، ڈرائیور بھی چاہئیں، کارخانوں اور کھیتوں
کرنے والے بھی چاہئیں۔
مسئلہ اصل میں سوچنے کا ہے، اور اپنے دماغ سے سوچنے کا ہے۔ ہم پہلے اورں
د کرتے تھے! اب یورپ کی کرتے ہیں!!!

دہلی کے سیمینار کے لیے رام پور میں عرشی صاحب کی بے تکلفانہ گفتگو ٹیپ کی گئی

ابوالحسن علی ندویؒ

تعلیم و تربیت کا نظام ایک ایسا لباس ہے جس کی قطع و برید قوموں کے قد و قامت، قومی خصائص، آبائی رسوم اور اُن بلند اقدار اور مقاصد کے مطابق ہونی چاہیئے جن کو یہ اپنی حیات و موت کا حاصل سمجھتی ہیں؛ ایسا لباس ہے جس میں ماحول، آب و ہوا، اور اس معاشرہ کا لحاظ بہت ضروری ہے جس میں قوم زندگی گزار رہی ہے۔ اسی طرح ان کے اختیار کردہ، اخلاق و عادات، ان کی تاریخ جس پر وہ فخر کرتی ہے اور اس مثالی کردار سے مطابقت بھی ضروری ہے جس پر وہ فریفتہ ہے اور جس کی مدح سرائی رہتی ہے۔

ماضی قریب کی دو تباہ کن جنگیں، جن کی قیادت علم اور تہذیب و تمدن کے چوٹی کے لوگوں نے کی، یہ ثابت کرنے لیے کافی ہیں کہ ترقی یافتہ تعلیم صالح اخلاق، انسانیت کا احترام اور کمزور اقوام کے ساتھ عدل کا جذبہ پیدا کرنے میں قطعی ناکام رہی۔ امریکہ، یورپ، ہندوستان اور دوسرے متعدد مشرقی ممالک میں یونیورسٹیوں کے نوجوانوں کا اخلاقی بگاڑ، طلبہ کی قانون اور نظم و انصرام میں دست درازیاں، اور طفلانہ خواہشات اور پست اغراض کی پیروی، — یہ سب صاف بتا رہے ہیں کہ تعلیم فی نفسہٖ مقصود نہیں، بلکہ وہ صرف ایک ذریعہ ہے جو کامیاب بھی ہو سکتا ہے ناکام بھی، نفع بخش بھی ثابت ہو سکتا ہے اور مضرت رساں بھی، اور تعمیر کا سامان بھی ہو سکتا ہے تخریب کا ذریعہ بھی؛ اور جب وہ اخلاق کی عظمت، صالح ذہنیت، صحیح عقیدہ اور مذہبی رجحان جیسے عناصر سے خالی ہو گا، تو نقصان کا پہلو نفع سے کہیں زیادہ ہو گا۔

ہم کو چاہیئے کہ ہم حقیقت پسندی کا ثبوت دیں، اور اعلیٰ تعلیم اور مغربی تہذیب کے بارے میں حقائق اور تجربات کی روشنی میں صحیح رائے قائم کریں۔ اسی کو تمام امراض کا واحد علاج نہ سمجھیں، بلکہ اس میں ایسے عناصر کا اضافہ کریں جو اس سے بگاڑ، الحاد اور اباحیت کے عوامل کا اثر زائل کر دے؛ اور اس کو اپنی ثقافت، اسلامی کردار اور مشرقیت کے عناصر سے ہم آہنگ کر لیں؛ اور اپنے عالمی، ابدی پیغام کے تابع بلکہ اس کا پاسبان بنا لیں۔

موسیٰ جار اللہ[۱]

جامعہ اسلامیہ علمیہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی جوبلی کی تقریب پر جامعہ کے شیخ ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام

لمثل هذا فليعمل العاملون (۳۷ : ۶۱)

وفى ذلك فليتنافس المتنافسون (۸۳ : ۲۶)

ایک ایسی اسلامی علمی یونیورسٹی کے وجود کی آرزو جس میں ایک طرف تمام اسلامی علوم کی تعلیم کا کامل انتظام ہو اور دوسری طرف موجودہ زمانہ کے علوم اور عمومی معارف کی تعلیم، عالم متمدن کے کالجوں کی اور یونیورسٹیوں کے نصابات کے بقدر دی جا سکے میری بہت قدیم آرزو ہے جس کو میں اپنے دل میں طالب علمی کے زمانے سے پرورش کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں ۱۸۹۸ء سے ۱۹۰۴ء تک میں نے تمام عالم اسلام کی سیاحت کی تاکہ میں اسلامی دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں شرعی عدالتوں اور دینی مدارس کے نظام نیز ان کے نصاب تعلیم کا مطالعہ کر سکوں۔ اس چھ سال کے عرصہ میں اسلامی دنیا کے اکثر بڑے شہروں کو میں نے دیکھ لیا اور اس طرح شرعی عدالتوں کے طریق کار اور اسلامی مدارس کے

۱؎ وسط ایشیا کے ایک مرحوم عالم اور عالم اسلام کے اہم مصلح جنھوں نے ایک عرصہ تک ہندستان (بمبئی اور بھوپال) کو اپنا وطن بنائے رکھا میرے دوست ظل عباس عباسی اور کرمفرما پروفیسر عبدالخالق نقوی کے بہت قریب تھے عباسی صاحب ہی نے مجھے نقوی صاحب کے اس ترجمہ تک پہنچایا اور اصل عربی متن بھی مقابلہ کے لئے عنایت کیا۔ عالمی حالات بہت بدل چکے تھے ورنہ موسیٰ جاراللہ کی صورت میں دنیا ایک اور جمال الدین افغانی سے متعارف ہوتی۔

نصاب تعلیم کے مطالعہ کی جو آرزو تھی وہ پوری ہوگئی۔ مدارس کے نظام تعلیم اور نصاب علم کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ عالم اسلام کے لیے یہ نظام اور یہ نصاب مفید اور سود مند نہیں اور اس پر قناعت کرنا کسی حال میں درست نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف میں نے یہ نظارہ دیکھا کہ شرعی عدالتوں میں اسلامی شریعت کے احترام کا کوئی اثر و شائبہ باقی نہیں رہا اور مسلمانوں کے دلوں سے ان کی اہمیت اور احترام بالکل اٹھ گیا۔ کیونکہ یہ عدالتیں صرف مفتیوں کے فتووں اور ان کے متضاد خیالات کے پیچھے پیچھے دوڑ رہی ہیں جو اکثر و بیشتر غلط ہوتے ہیں۔ اسلامی مدارس کا نظام، جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا، مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی ضرورتوں کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ مغربی ترکستان کا حال دینی مدارس اور شرعی عدالتوں کے لحاظ سے اور بھی خراب پایا۔ یہاں کے لوگوں نے زندگی کے اہم ترین مسائل کے لئے شریعت کے نام پر بہت ہی خوفناک حیلے تراش لئے ہیں۔ جن کے نتیجہ میں اسلام اپنی بنیاد ہی سے باطل ہو کر رہ جاتا ہے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ یہ اور اسی قسم کے دوسرے اسباب ہیں جنھوں نے اسلامی حکومتوں میں اجنبی سیاست کی دخل اندازی کے لئے دروازے کھول دیئے ہیں چنانچہ مصر میں شرعی عدالتوں کے بجائے "محاکم مختلطہ" یعنی ملی جلی عدالتوں کے نام سے نئی عدالتیں وجود پذیر ہوگئیں۔ اور ترکی میں "تنظیمات خیریہ" کے نام سے جدید اصلاحات نے خلافت عثمانیہ میں اسلامی نظام پر زمین تنگ کر دی۔ رہ گئیں افغانی اور ایرانی حکومتیں، تو ان میں بھی شریعت اسلامیہ کی نہ کوئی قوت باقی رہی اور نہ کوئی حرمت، قرآن کریم محض نام کے لئے ایک قابل احترام کتاب رہ گئی ورنہ حقیقتہً امت کے اور حکومت کے دل میں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اور وہ دن دور نہیں، جبکہ یہ دونوں حکومتیں بھی مصر اور ترکی کے نقش قدم پر گامزن ہوتی ہوئی نظر آئیں گی۔

اس کا بنیادی سبب شرعی محاکم اور دینی مدارس کی نادرستی ہے۔ کیونکہ ہر قوم اور ہر ملت کا عروج و زوال اس کے مدارس اور محاکم کے صلاح و فساد پر موقوف ہے۔

سنہ ۱۹۰۴ کے آخر میں میری سیاحت کا سلسلہ ختم ہوا اور پھر پیٹرسبرگ یعنی لینن گراڈ میں میرا مستقل قیام ہوگیا۔ ۱۹۰۵ء کے ابتدا میں میری پہلی کتاب

چھپ کر نشر ہوئی۔ اس کتاب میں میں نے اسلامی دنیا کی درسگاہوں کا حال اجمالی طور پر بیان کیا ہے۔ عالم اسلام کے امیر الشعراء ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم نے جب اسلامی درس گاہوں کے بابت میرا یہ بیان پڑھا تو انھوں نے اس کو شعر و ادب کے سنہری قالب میں ڈھال کر اس طرح فرمایا۔

بایں مکتب بایں دانش چہ نازی　　　کہ ناں بر کف نداد و جاں ز تن برد

دنیائے اسلام کی حالت پر اس سے زیادہ جامع اور مختصر تنقید کیا ہو سکتی ہے۔ اگر یہ ایک طرف سخت تنقید ہے تو دوسری طرف اس حکیمانہ تدبیر و حید کی طرف بھی اشارہ ہے جس کے ذریعہ سے دین حق پھر ایک بار، عہد رسالت اور عہد خلافت راشدہ کے مانند دنیا پر غالب و فیروزمند بن سکتا ہے۔ اور اسلام کی عظمت رفتہ پھر واپس آسکتی ہے۔

اب ہم کس دن کا انتظار کر رہے ہیں؟ کیا قیامت کے دن ہم بیدار ہونگے؟ اور اگر قیامت کا انتظار ہے تو وہ بھی برپا ہو چکی ہے، ترکستان، روس اور ترکی میں انقلاب نے قیامت برپا کر دی اور یہاں کے اسلامی نظام، شرعی عدالتوں اور دینی مدارس کی بنیادیں منہدم ہو کر اپنے تاریخی، سیاسی اور اجتماعی گناہوں کے ملبہ میں اس طرح دفن ہو گئیں کہ ان کی اس تباہی پر نہ آسمان رویا اور نہ زمین نے نوحہ خوانی کی حتیٰ کہ اس حال زار پر خود ان ملکوں کے باشندوں میں سے بھی کسی کی آنکھ پرنم نہ ہوئی۔

الا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُودُ۔

ان اسلامی بنیادوں کو کس نے منہدم کیا؟ کیا موجودہ انقلاب اس کا سبب بنا؟ نہیں بلکہ یہ عمارتیں معنوی طور پر برسوں پہلے گر چکی تھیں۔ اور ان پر موت واقع ہو چکی تھی۔ مگر اہل غفلت اس وقت بیدار ہوئے جبکہ انقلاب کا سیلاب اپنی دہشتناک موجوں میں باقیماندہ اسلامی آثار عظمت کو بہا کر لئے جا رہا تھا کاش کہ جاگنے والے کچھ پہلے بیدار ہو جاتے اور طوفان کے آنے سے پہلے اپنی نجات کا کچھ انتظام کر لیتے۔

یہ ہیں وہ خوفناک مصائب، جن کا ہم آج شکار بنے۔ اور کل —— اے ہندوستان کی اسلامی درسگاہو! تم کو یہی دن دیکھنا ہوگا۔ لہٰذا پہلے سے تیار ہو جاؤ اور طوفان کے آنے سے پہلے کشتی تیار کر لو۔

وما قوم لوط منكم ببعيد

ہندستان میں اسلامی مدارس بکثرت ہیں، سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں۔ ان کا نظام تعلیم اور نصاب علوم یکساں ہے۔ آج اُن کی حالت اُس وقت سے بھی گئی گذری ہے جو اب سے پہلے میں نے دیکھی تھی۔ دینی مدارس اور عصری درسگاہوں کے مابین زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس کے باوجود اسلامی درسگاہوں کے اولیاء و سرپرست اور ان کے تمام اساتذہ بے خبر اور غفلت میں مبتلا ہیں۔

"یمرون علیھا وھم عنھا معرضون" وہ سب سے خیالی پلاؤ پکاتے اور اپنے سینوں میں طرح طرح کی آرزوئیں پرورش کرتے ہیں وہ بزعم خویش آسمانی کرسیوں پر بیٹھ کر کرۂ زمین پر الٰہی اور ربّانی حکومتیں قائم کرتے ہیں اور خود ان کے امیر و خلیفہ بن جاتے ہیں۔ حالانکہ ان جیسے بلند مقاصد کے لئے ان کی تیاریاں کچھ بھی نہیں۔ سچ ہے کہ وقت سے پہلے اور تیاری کے بغیر جو کسی بات کی خواہش کرتا ہے وہ ہمیشہ اس سے محروم رہتا ہے اور اس کے خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتے۔ — روس میں جب تمام دینی مدارس اور ابتدائی مکاتب بند ہوگئے تو میں نے از سر نو دینی اور علمی اسباق کے احیاء کے لئے کمر ہمت باندھ لی۔ مجھے نہ کوئی عمارت درکار تھی اور نہ بہت سا ساز و سامان، زمین کا فرش اور آسمان کی چھت کافی تھی۔ میں تنہا تھا میرے ساتھ کوئی کام کرنے والا بھی نہ تھا اور نہ میں نے اس سلسلے میں کسی سے استعانت کی یہاں تک کہ شوقین طالب علموں کی ایک اچھی خاصی جماعت میرے گرد جمع ہوگئی۔ میں نے ان اسباق کی ترتیب و نظام سے متعلق ایک مختصر مضمون بھی لکھا اور ترکستان کے اسلامی شہروں نیز روس کے اسلامی علاقوں اور آبادیوں کا میں نے دورہ کیا۔ اس طرح میں نے اپنے اغراض و مقاصد اور اپنا تعلیمی پروگرام ہر اسلامی آبادی میں پہنچادیا۔ اس کام کے لئے میں نے نہ تو کسی سے چندہ کا سوال کیا اور نہ غیر اللہ کے خوف کو اپنے دل میں جگہ دی۔

اسی زمانے میں میرے پاس تین طالب علم آئے جو عربی پڑھنا چاہتے تھے چنانچہ میں نے روزانہ سات ماہ تک عربی زبان و ادبیات کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اس مختصر مدت میں ان طالب علموں کی استعداد بہت اچھی ہوگئی۔ عربی زبان کے قواعد و اصول اور ادب پر ان کی نظر بہت گہری ہوگئی۔ اب مجھ کو یقین ہوا کہ اگر استاد کی طرف

سے محنت اور اہتمام، اور طالب علم کی طرف سے شوق اور رغبت ہو تو نہ کوئی زبان مشکل ہے اور نہ کوئی علم۔ طالب علم ہر زبان اور ہر علم کو آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ تمام زبانیں اور تمام علم برابر آسان اور برابر مشکل ہیں۔ صرف پڑھنے والے کا شوق اور پڑھانے والے کا طریق تعلیم کسی علم اور کسی زبان کو آسان اور مشکل بنا دیتا ہے۔

آج مدارس کے سرپرستوں اور علماء و اساتذہ کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ نظام تعلیم کی اصلاح اور نصاب علوم کی تکمیل کی جانب متوجہ ہوں۔ بلاشبہ ہندستان کے مسلمان، دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے مقابلہ میں مطلوبہ "اسلامی علمی یونی ورسٹی" کی تاسیس پر زیادہ قادر ہیں۔ ہندستان میں کئی اسلامی درسگاہیں موجود ہیں جن میں دہلی کی "جامعہ ملیہ اسلامیہ"، ہماری آئیڈیل "اسلامی علمی یونیورسٹی" کے سانچے میں ڈھل جانے کے لئے زیادہ قریب اور زیادہ صلاحیت پذیر ہے۔

میں اپنے اس مضمون کے شروع ہی میں یہ بتلا چکا ہوں کہ جامعہ اسلامیہ اور جامعہ علمیہ سے ہماری کیا مراد ہے۔ اب میں ارباب علم اور اساتذہ مدارس کے روبرو، اُس "اسلامی علمی یونیورسٹی" کے نظام اور نصاب تعلیم کا ایک خاکہ اپنے تصور کے مطابق پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ میرا تصور اور میرا پیش کردہ خاکہ اپنی شکل و صورت میں اُس نظام تعلیم کے ابتدائی نقش کا حکم رکھتا ہو جس کو آگے چل کر اہل علم دینی مدارس کی اصلاح کرتے وقت یا اسلامی علمی یونیورسٹی کی تاسیس کے موقعہ پر زیادہ وسیع اور زیادہ مکمل شکل میں ترتیب دیں گے۔ میں نے اس سلسلے میں رامپور کے مدرسہ عالیہ کے نظام سے متعلق ایک کتاب بھی دیکھی ہے جو قریب قریب مدرسہ دیوبند کے نظام سے ملتی جلتی ایک چیز ہے۔

تعلیم کا پروگرام

(۱) سب سے پہلا اور سب سے زیادہ اہم بنیادی اصول تو یہ ہے کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم میں ترتیب کی خاص رعایت رکھی جائے۔ علوم دینیہ کی تعلیم پر ادبیات کی تعلیم مقدم کی جائے۔ یعنی یہ کہ اصل زبان اور اس کی صرف و نحو اور بلاغت کی تعلیم۔ قرآن کریم کے معانی و مطالب اور حدیث کی تعلیم

سے پہلے ہونا چاہئے اور کتاب و سنت کی تعلیم علوم فقہیہ اور علوم کلامیہ پر مقدم کی جائے۔ کیونکہ اسلامی فقہ و عقائد اور تمام شرعی علوم کا سرچشمہ قرآن حکیم اور حدیث نبی کریم ہے۔ لہٰذا فقہیات و عقائد ایسے طالبعلموں کو پڑھانا جو نہ تو قرآن کریم کے معانی کامل طریقے پر جانتے ہیں اور نہ کتب حدیث پر ان کی نظر ہے بالکل فضول کوشش ہے اور طالب علم کی عمر برباد کرنے کے سوا اس کا کوئی نتیجہ نہیں یہی وجہ ہے کہ طالب علم کسی کتاب کو بھی بغیر شروح و حواشی کی مدد سے بالکل نہیں سمجھتا۔ طالب علم کا اپنے اسباق کے سمجھنے میں شرح و حاشیہ کا محتاج ہونا اور اپنے وقت کا ایک بڑا حصہ لمبے چوڑے حواشی اور دور از کار شروح میں صرف کر دینا نظام تعلیم کے فساد کا نتیجہ ہے۔ اور اگر تعلیم کے وقت علوم کی ترتیب کو پیش نظر رکھا جائے تو اس قسم کی خرابیوں کے واقع ہونے کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہ سکتا۔

(۲) دوسرا سب سے زیادہ بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر فن اور ہر علم کے پورے پورے مسائل اپنی اپنی جگہ پر پڑھائے جائیں۔ کسی فن کے چند مسائل پر اکتفار کر لینا یا کسی فن کی کتاب میں سے بعض فصلیں بڑھا دینا درست نہیں۔ اگر تعلیم میں ان دونوں اصولوں کی ترتیب کے ساتھ رعایت کی جائیگی تو طالب علم شروح و حواشی سے بالکل بے نیاز ہو جائے گا، اور اپنے تمام درس کو ضبط و اتقان کے ساتھ یاد رکھ سکے گا۔ اس کے علم میں زندگی ہوگی جس سے خود اس کا دل مطمئن ہوگا۔ اور آئندہ کی تعلیم میں کبھی اس کا دل و دماغ پراگندگی و خلفشار کا شکار نہ ہوگا۔

(۳) مدارس میں علوم ادبیہ کی تعلیم کا اصلی مقصد، چونکہ کتاب و سنت کے مطالب و معانی کا فہم و ادراک ہے لہٰذا ادبی علوم کے پڑھانے میں سب سے زیادہ مناسب اور سب سے زیادہ مفید یہ چیز ہوگی کہ ہم اس سلسلے میں کتب سلف کو ترجیح دیں یا ایسی کتاب کا انتخاب کریں جو اصول سلف کے مطابق لکھی گئی ہو۔ البتہ ایسے استاد کو جس کو مسائل کا استحضار ہو یہ حق ہے کہ وہ فن کے مسائل بطریق اجمال ایسی کتاب سے بھی پڑھا سکتا ہے جس میں تحصیل کو پیش نظر رکھا گیا ہو۔ مثلاً علم نحو میں کتاب الدروس النحویہ سے مدد لی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ کافیہ کا طریق بیان لغو اور مہمل قرار دیا جائے۔

(۴) علم صرف پڑھانے کے لئے ضروری یہ ہے کہ مستحضر معلم شافیہ اور مراح کے

مسائل ایسے طریقہ پہ بیان کر دے کہ طلباء کے ذہن نشین ہو جائیں. کیونکہ کوئی صوفی اور کوئی قاری شافیہ کے مسائل سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ جو طالب علم عربی مادوں کے تصرف اور ابنیہ اسماء وافعال کے اصول جاننا چاہتا ہے اس کے لئے شافیہ اور مزہر کے بیان کردہ مسائل کی واقفیت ناگزیر ہے۔ درحقیقت ان کتابوں کے مسائل سے ہم کو سروکار ہے، محض کتابوں کی عبارتوں سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں۔

علم نحو میں کافیہ کے مسائل رضی کی شرح کے ساتھ اور الفیہ کے مسائل اشمونی کی شرح کے ساتھ بہت کافی ہیں۔ ہمارا مقصد مسائل کو سمجھنا اور ان کو یاد رکھنا ہے۔ جس نے ان مسائل کو سمجھ کر یاد کر لیا وہ صحیح معنی میں نحوی کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ اب آسانی سے قرآن کریم کے معانی اور دواوین سنت کے مطالب کو صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے۔

علم صرف اور علم نحو کے اسباق کے دوران میں متن لغت پر بھی طالب علم کی اچھی خاصی نظر ہو جائے گی اور وہ عربی الفاظ یعنی اسماء افعال اور حروف کے معنی سمجھنے لگے گا۔ اور صحیح پڑھنے صحیح لکھنے صحیح بولنے پر قادر ہو جائے گا۔

(۵) گزشتہ چار نمبروں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اگر اس ترتیب سے طالب علم کی تعلیم ہو گی تو اب اس میں اس قدر استعداد پیدا ہو چکی ہو گی کہ وہ "متن کافی" اور "صبان" و "خزرجیہ" کی مختصر نظموں سے علم عروض و قوافی آسانی سیکھ سکے اور خلیل کے مقرر کردہ نظام کے مطابق عربی شعر کی بحروں کو یاد کر سکے۔ علم عروض میں دس ارکان اور پانچ دوائر سے جس قدر مستعمل اور غیر مستعمل بحریں استخراج کی گئی ہیں، نیز جتنے زحافات و علل ہیں ان کے لئے خلیل کا بتلایا ہوا نظام عجیب و غریب ہے۔ تمام اسلامی شعراء نے تمام زبانوں میں خلیل ہی کے طریقہ کی پیروی کی ہے اس لئے علم عروض میں خلیل کے طریقہ کا جاننا ہر مسلمان عالم کے لئے سودمند اور مفید ہے اور اس کی تعلیم مدارس میں ضروری ہے۔

علم عروض و قافیہ میں "کافی" اگرچہ ایک آسان متن ہے لیکن اس میں پھر بھی ایک قسم کا انتشار ہے جس کو یاد کرنا ہر طالب علم کے لئے آسان نہ ہو گا۔ البتہ خزرجیہ اور منظومۃ الصبان کے جس نے چالیس شعر یاد کر لئے وہ خلیل کے نظام کے مطابق علم عروض سے اچھی طرح واقف ہو جائے گا اور اس کو کبھی فراموش نہ کرے گا۔

۶۔ اب عربی شعر کے دیوانوں تک طالب علم کی رسائی آسان ہو جائے گی یہ دواوین عربی ادب کا قیمتی خزانہ ہیں اور اس موضوع پر ائمہ ادب کی بہت سی کتابیں ہیں ان کے مطالعہ کے لیے طالب علم کو ذرا زیادہ محنت اور کوشش سے کام لینا ہوگا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ تعلیمی گھنٹوں میں اتنی گنجائش نہ نکل سکے کہ طالب علم ضروری کتب ادب کا مطالعہ کر سکے لیکن اگر طالب علم اپنے شوق اور محنت کو کام میں لائے گا تو ان میں سے کوئی چیز بھی اس سے نہ چھوٹے گی۔

عربی شعر و ادب کے یہ دیوان اس لئے ضروری ہیں کہ ان میں قرآن حکیم اور سنن نبی کریم کی زبان و شواہد کے علاوہ عرب کی تاریخ، عرب کا نظام زندگی سوشل اور اخلاقی حالات نیز عربوں کے علوم و فنون، غرضیکہ سب ہی چیزیں موجود ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ جزیرۂ عرب میں اسلام کا ظہور تاریخی شواذ میں سے نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ کتاب الاغانی عرب کی فضیلت و علوم تبت کے بیان میں سب سے زیادہ اہم کتاب ہے

۷۔ اس کے بعد دواوین السنن اور احادیث ثابتہ کی کتابوں کا نمبر آتا ہے۔ طلباء کی جماعت جس نے گذشتہ نمبروں میں بیان کردہ ترتیب کے ساتھ تمام چیزیں حاصل کر لی ہوں تو اب ایک اچھا اور ہوشیار استاد موطا اور تجرید بخاری سے علم سنتہ کی تعلیم شروع کرائے اس تعلیم کے لئے چند ماہ کی مدت اور تھوڑے سے اسباق کافی ہوں گے۔ ان اسباق کی تعلیم کے دوران مدرس کو چاہئے کہ وہ اپنے طالب علموں کو علم اصول حدیث کی وہ تمام اصطلاحات جو نخبہ یا نزھتہ میں بیان کی گئی ہیں۔ سکھا دے۔ نخبہ مختصر اور مفید متن ہے اور اپنے مقصد کے لئے بالکل کافی ہے۔

ان دو کتابوں کی تعلیم کے بعد ائمہ اُمت کی صحاح ستہ اور امام طحاوی کی معانی الآثار طلبہ کو بطریق روایت پڑھائی جائیں۔ جہاں تک درایت کا تعلق ہے۔ درایت اب اس جماعت کو حاصل ہو چکی ہے۔ ہاں اگر استاد کچھ نئے افادات رکھتا ہو تو البتہ ان سے اپنے طلبہ کو محروم نہ کرے۔

انما الاذکر من الرحمن محدث" (۵:۳۶)

۸۔ علم سنت کے بعد قرآن حکیم کے مطالب و معانی سمجھنے کی نوبت آتی ہے۔

قرآن کریم کی تعلیم کے سلسلہ میں استاد کو چاہئے کہ
علوم قرآنیہ میں جو مختصر متون ہیں ان سے ابتداء کرے: مثلاً امام شاطبی کا لامیہ
عقلیہ اور امام جزری کا الالفیۃ الطیبۃ۔ طلباء کی اس جماعت کو
جو علوم عربیہ میں دستگاہِ کامل رکھتی ہو۔ استاد چند ماہ میں ان کتابوں کی تعلیم دے
سکتا ہے اور ہر طالب علم آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ ان چیزوں کے بعد استاد
قرآن کریم کے معانی شروع سے آخر تک اپنے طلباء کو بتلائے۔ معانی قرآن کی
تعلیم میں اس امر کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے کہ طالب علم کو از روئے
مصحف ہی معانی بتلائے جائیں یا زیادہ سے زیادہ جلالین اور بیضاوی سے امداد
لی جا سکتی ہے کیونکہ ہماری اس جماعت میں اب کافی استعداد و صلاحیت اور علم
کی اچھی خاصی قوت پیدا ہو چکی ہے۔ استاد کو چاہئے کہ وہ ان طلباء کو قرآن فہمی میں
آزادی کو کام میں لانے دے۔

معانی قرآن کریم کی بنیاد نظم قرآنی ہے۔ نظم قرآن جن معانی پر دلالت و
رہبری کرتا ہے وہی ہمارے لئے اہمیت رکھتے ہیں، ہمیں کسی کی رائے سے کوئی
سروکار نہیں اور نہ اس سے کچھ بحث کہ کتب احادیث میں کیا وارد ہوا ہے خود
نظم قرآنی کا افادہ ان سب سے بالا و برتر ہے۔ اور اپنے ثبوت و وسعت کے لحاظ
سے بھی نظم قرآنی کا درجہ کہیں زیادہ ہے۔ اسباب نزول جو بیان کئے جاتے ہیں اول
تو ہر ایک کا ثبوت نہیں اور اگر ثبوت بھی ہو تو اس سے نہ تو نظم قرآن کی عمومیت میں
خصوصیت پیدا ہوتی ہے اور نہ افادہ نظم کی وسعت کو ہم آہنگ کر سکتے ہیں۔

۹۔ اس کے بعد علم عقائد، علم کلام، اور فلسفہ و منطق کا درجہ آتا ہے علم العقائد
کی تعلیم امام طحاوی کی کتاب "بیان السنۃ" یا امام محمد عبدہ مفتی مصر کے رسالۃ التوحید
سے دی جائے۔ علم کلام کے لئے "مواقف" سے بہتر کوئی کتاب نہیں، قدیم
فلسفۂ الٰہیات، کتاب "حکمۃ العین" سے پڑھایا جائے۔ اور منطق کے لئے
کوئی مختصر سی کتاب یا "تہذیب" کافی ہوگی۔ یہ چاروں درس دو سال کی مدت
میں سابقہ دروس کے ساتھ ساتھ ختم کرا دیئے جائیں۔

۱۰۔ اس کے بعد مذہبی فقہ کی تعلیم کسی مختصر متن سے دی جائے "تنویر
الابصار" زیادہ مفید ہوگی۔ اور ایک کتاب اصول فقہ میں پڑھائی جائے۔

"توضیح" یا "المستصفی" میں سے ایک کتاب منتخب کی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد ہدایہ اور "مجلۃ الاحکام العدلیہ فی الفقہ" درس میں آنا چاہئیں۔

۱۱۔ سیرت نبی کریم کے موضوع پر "زاد المعاد" سے بہتر کوئی کتاب نہیں اسمیں سیرت کے علاوہ فقہی، اجتماعی اور سیاسی احکام بھی آنحضرت کی سیرت اور سنن ثابتہ سے استنباط کئے گئے ہیں۔ اگر طالب علم ان چیزوں کو پڑھ لے گا تو اس میں اجتہاد کی قوت اور استنباط مسائل کا ملکہ پیدا ہوجائے گا۔

قانون سازی کے فلسفہ اور اصول شرع کو سمجھنے کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی "حجۃ اللہ البالغہ" بہترین کتاب ہے درحقیقت اس کتاب کا موضوع اصول فقہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے، موجودہ زمانے کے اقتصادی اور مدنی قوانین کے مقابلہ میں شریعت اسلامیہ کی فضیلت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

(۱۲) قرآن حکیم نے آداب اسلامی اور فرائض دین سے زیادہ تمام کائنات کا ذکر کیا ہے۔ نجوم وکواکب اور افلاک وسماوات سبھی کا بیان کتاب اللہ میں موجود ہے۔ اور جگہ جگہ ان تمام چیزوں پر تدبر وتفکر کی دعوت دی گئی ہے کتب تفاسیر، ستاروں کی دنیا کے تفصیل حال سے قاصر ہیں۔ اس لئے "اسلامی علمی یونیورسٹی" کو اپنے نصاب تعلیم میں قدیم وجدید ہیئت کا داخل کرنا ضروری ہے۔ بلکہ اس کے علاوہ ایسے فلکیاتی اٹلس کا درس ومطالعہ بھی لازمی قرار دیا جائے، جو یورپ یا امریکہ میں صحت وصفائی کے ساتھ طبع کیا گیا ہو۔ فلکیاتی اٹلس میں ثوابت وسیارات اور نجوم وکواکب کی تمام تفصیل مل جاتی ہے۔ اس میں ہمارے اس نظام شمسی کے علاوہ ہزاروں دوسرے نظام شمسی اور لاکھوں ستارے دکھائے۔

اس لحاظ سے فلکیاتی اٹلس کا مطالعہ، ہر مسلمان عالم کا دینی اور علمی فرض ہے تاکہ قرآن کریم کی ان آیات کے معانی ومطالب کی زیادہ سے زیادہ وضاحت ہوسکے جن میں نجوم وسماوات کا ذکر آیا ہے۔

میر آلامی عبد الرحمٰن ایک ترکی عالم ریاضیات وفلکیات نے اس موضوع پر تین بڑی بڑی جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "المصاحبات الفلکیۃ

فی الآیات الفقری آنیست ہے۔ میں نے اس کتاب کو نہایت ذوق وشوق اور روحانی کیف وسرور کے ساتھ چند روز میں پڑھا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اس کے مطالعہ میں کوئی بھی نہ اکتائے گا۔ جب جرمنی عالموں کو اس کتاب کا پتہ لگا تو انھوں نے اس کی خریداری کے لیے ہزاروں پونڈ کی رقم پیش کی لیکن مصنف کی غیرت مند فطرت نے یہ سودا گوارا نہیں کیا۔ وہ بھی پسند نہیں کرتے کہ ان کی کتاب ترکی کے مطبعوں میں لاتینی حروف سے چھاپی جائے۔ ان کی خواہش یہی ہے کہ یہ کتاب اسلامی عربی حروف میں طبع ہو۔

میں مصنف کتاب سے ،انقرہ میں ان کے دفتر میں جا کر ملا ہوں۔ وہ مجھے اپنے گھر بھی لے گئے اور ہماری اس مجلس میں مصنف کی بیگم اور ان کی لڑکیوں نے بھی شرکت کی۔ مصنف نے اپنی کتاب میری طرف بڑھائی اور میں نے ان کے سامنے کتاب کا دیباچہ پڑھا جو مصنف نے وجود باری تعالیٰ اور اس کی وحدت کے اثبات پر ایک انوکھے ریاضی استدلال کے ساتھ لکھا ہے مصنف کو یہ دیکھکر بہت تعجب ہوا کہ میں نے ان کا یہ جدید ریاضی استدلال صحت کے ساتھ پڑھا اور ان کو زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ میں صرف پڑھ ہی نہیں رہا ہوں بلکہ اچھی طرح سمجھتا بھی جاتا ہوں۔ اور مجھے حیرت یہ تھی کہ میرے اور مؤلف کتاب کے مابین آیات کریمہ کے معانی اور علمی مسائل پر جو گفتگو ہوتی رہی اس میں ان کی بیوی اور لڑکیوں نے برابر شرکت کی۔

اگر مصنف نے ابھی تک اپنی کتاب طبع نہیں کرائی ہے تو میری دلی آرزو ہے کہ ان شاء اللہ اگر میری زندگی نے کچھ دن اور ساتھ دیا تو ایک روز اس کو میں چھپواؤں گا۔

ہیئت قدیمہ اگرچہ قرآنِ کریم کی تمامتر مخالف ہے لیکن اجرام فلکی کی حرکات کو ضبط کرنے میں اس کا نظام بہت ہی عجیب، بہت ہی خوب صورت اور بہت ہی دقیق ہے۔ ہیئت قدیمہ کے اس نظام کو فلاسفہ کے سب سے بڑے دماغ نے وضع کیا ہے۔ اور حکماء اسلام کے بڑے بڑے دماغوں نے اس سے دھوکا کھایا ہے۔ فارابی، ابن سینا اور نصیر الدین طوسی سب ہی اس سے مرعوب ہوئے ہیں، چنانچہ کتب تفسیر نے بھی مطالب قرآنی کے بیان میں اسی نظام

ہیئت کی پیروی کی ہے۔

ان اسباب کی بناء پر، جامعہ اسلامیہ کے نصاب تعلیم میں ہیئت قدیمہ کا ہونا ازبس ضروری ہے۔ اور ہماری جامعہ کے طلبا کو قدیم نظام ہیئت سے لاپرواہی برتنا کسی حال میں ٹھیک نہیں۔

۱۳۔ علماء اسلام نے "فلسفہ، تصوف" اور ادب پر جو کچھ لکھا ہے، اور اسلامی عہد میں دنیا کے بزرگ ترین شعراء نے جو کچھ کہا ہے اس کا بہت بڑا ذخیرہ فارسی زبان میں ہے۔ اس لحاظ سے ضروری ہے کہ "جامعہ اسلامیہ" میں فارسی زبان کا درس بھی لازمی قرار پائے جو سعدی اور جامی کی زبان ہے حکماء و شعرائے اسلام کے علمی و فنی آثار کو داخل نصاب قرار دیا جائے یعنی مولانا روم کے دفاتر مثنوی، خاقانی، نظامی اور جامی کی کلیات بر ان اشعار کے آثار جو اس طبقہ میں شمار کئے جاتے ہیں، سب ہی پر ایک مسلمان عالم کی نظر پڑنا ضروری ہے۔

۱۴ اور اگر مجھے اختیار ہوتا تو عربی شعر و ادب کے درس کے ضمن میں یونان کے مشہور شاعر ہومر کی مشہور ترین نظم الیڈ (الیاذہ) کا عربی ترجمہ مع اس کے قیمتی مقدمہ کے داخل نصاب کرتا۔ عربی ادب میں الیاذہ کا ترجمہ ایک بہت ہی مفید اضافہ ہے۔ اور اس کا مطالعہ، عربی شعر و ادب کے منتہی کے لئے بہت سے علمی اور ادبی وجوہ کی بناء پر قریب قریب ضروری ہے۔

۱۵۔ اگر مجھے اختیار دیدیا جائے تو میں جامعہ کی اسلامی شاخ کے سلسلہ میں یہ عہد عتیق (اولڈ ٹیسٹامنٹ) اور عہد جدید (نیو ٹیسٹامنٹ) کے علمی درس کا بھی اضافہ کر دوں۔ عہد عتیق اور عہد جدید کا درس علماء اسلام کے لئے ازبس ناگزیر ہے لہٰذا جامعہ اسلامیہ کا اس مضمون سے خالی رہنا اور ہمارے طلبہ کا اس طرف سے غفلت برتنا مناسب نہیں۔ قرآن کریم نے ہر دو عہد کے بہت سے قصص کا ذکر کیا ہے۔ اور بہت سی آیات میں تورات و انجیل کے بہت سے احکام بیان فرمائے گئے ہیں اور بہت سے ان قصص و احکام کی تردید و تغلیط کرتی ہیں جو عہد قدیم اور عہد جدید میں وارد ہوئے ہیں۔

"ان ھذا القرآن یقص علی بنی اسرائیل"

اکثر الذی ھم فیہ یختلفون (النحل - ۷۶)

کیا علماء سلف نے تورات و انجیل میں بحث و تحقیق اور ردّ و استشہاد کو اپنا موضوع (SUBJECT) بنایا ہے۔ امام رازی نے اپنی تفسیر کبیر میں عہد عتیق و عہد جدید سے کئی چیزیں نقل کی ہیں اور ان کے بارے میں جو کچھ امام رازی نے کہا ہے اس میں کچھ باتیں اگر قابل قبول ہیں تو کچھ چیزیں قابل رد بھی ہیں اور امام رازی کا یہ طریقہ ہے کہ ان کے اعتراضات بہت قوی اور ان کے جوابات جو اپنی ہی طرف سے پیش کرتے ہیں بہت ضعیف ہوتے ہیں۔

امام قرافی نے اپنی کتاب "الاجوبۃ الفاخرۃ" میں کتب عہدین سے جو کچھ نقل کیا ہے وہ سب کا سب صحیح ہے۔ تورات و انجیل کی چھان بین کرنے والوں میں امام قرافی کا درجہ سب سے زیادہ بلند ہے۔ اسی موضوع پر امام آلوسی کی کتاب "القول الفسیح فی مالفقہ عبد المسیح" بھی نہایت ہی نفیس اور مکمل کتاب ہے۔ امام رحمت اللہ ہندی کی کتاب "اظہار الحق" بھی ایک علمی اور مفید کتاب ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ مصنف نے نصرانی مبلغین کو لاچار و لاجواب کر دیا ہے۔ "منہاج السنۃ النبویہ" بھی اسی سلسلہ کی ایک کتاب ہے جس میں اس موضوع پر کافی اہم مواد جمع کیا گیا ہے۔

اکثر علمائے اسلام تورات و انجیل میں نسخ و تحریف کا دعویٰ کرتے ہیں، حالانکہ اس دعوی کی ضرورت نہیں۔ اگرچہ کتب عہدین میں ایک نہیں، ہزار تحریفات کی گئی ہوں لیکن آج ہمارے لئے یہی چیز مفید ہے کہ ہم عہد قدیم و جدید کو اسی طرح قبول کرلیں جس طرح تمام تراجم کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں۔ ہم اس کو اس طرح تسلیم کریں کہ کتب عہدین ہمارے اور اہل کتاب کے مابین ایک مانا ہوا اور تسلیم شدہ مقدمہ ہیں۔ ہم دیکھیں گے کہ قرآن کریم کی فضیلت و بزرگی کس طرح کتب عہدین پر غالب آتی ہے۔

قرآن کریم تورات کی کئی جگہ ثنا خوانی کرتا ہے۔ "ولقد آتینا موسی الکتاب من بعد ما اھلکنا القرون الاولی بصائر للناس وھدی ورحمۃ لعلھم

یتذکرون" (القصص ۴۳)

"قل فاتوا بکتاب من عند اللہ ھو اھدیٰ منھما اتبعہ" (القصص ۴۹)

"وآتیناھما الکتاب المستبین وھدیناھما الصراط المستقیم" (الصافات ۱۱۷)

میں نے اپنی کتاب "یاجوج" میں عہد قدیم وجدید کا اجمالی بیان پیش کیا ہے اور بتلایا ہے کہ انجیل حضرت مسیح کی کتاب نہیں تھی بلکہ انجیل کی حقیقت وہ ہے جو سورۂ صف میں بیان کی گئی ہے۔ "واذ قال عیسیٰ ابن مریم یا بنی اسرائیل انی رسول اللہ الیکم مصدقا لما بین یدی من التوراۃ ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد" حضرت مسیح نے تورات کے سوا کسی کتاب کا ذکر نہیں کیا اور اگر ان کے پاس تورات کے علاوہ کوئی اور کتاب ہوتی تو اس کا ضرور ذکر کرتے۔

میری رائے میں ان .... اس لئے نہیں کہ اہلِ کتاب سے ہم مجادلہ کریں بلکہ اس لئے کہ قرآن کریم کی سیکڑوں آیات کے سمجھنے میں ہم کو مدد مل سکے۔

۱۶۔ مندرجہ بالا نمبروں میں جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ جامعہ اسلامیہ کے نصابِ تعلیم میں صرف علوم اسلامیہ کے شعبے سے متعلق میرا تصور ہے باقی رہا جامعہ اسلامیہ کا علمی شعبہ تو اس کی بابت کسی طویل وعریض بیان کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ جامعہ اسلامیہ کے علمی شعبہ کا نظام تمام عالم متمدن کے ثانوی مدارس کے معیار کے مطابق ہونا چاہئے۔ اور طبیعات وریاضیات نیز دیگر معارف عمومیہ (POPULAR SCIENCES) کا نصاب ہماری جامعہ اسلامیہ میں مہذب دنیا کی درسگاہوں سے کم نہ ہونا چاہئے۔

جامعہ اسلامیہ علمیہ اپنے اس نظام اور اس نصابِ تعلیم کے ساتھ اسلامی دنیا کی ایک اہم ترین ضرورت ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی باقاعدہ اور منظم درسگاہ نہیں ہے جہاں تمام اسلامی علوم کامل طریقے پر پڑھائے جاتے ہوں۔ اور جب یہ نہیں ہے تو علوم اسلامیہ میں ایک مسلمان کی انتہائی اور مکمل تعلیم کی امید سوائے

ہماری مطلوبہ اسلامی علمی یونیورسٹی کے کسی دوسری درسگاہ سے نہیں ہوسکتی۔

پوری اسلامی دنیا میں اپنے قسم کی واحد درسگاہ یہی جامعہ اسلامیہ علمیہ ہوسکتی ہے۔ اس میں پڑھنے کے لئے فرزندان و دختران اسلام میں سے وہی لوگ لئے جا سکتے ہیں جو اپنی پوری زندگی اسلام اور اسلامی علوم کے لئے وقف کر سکتے ہوں سینے باکمال بننے کے لئے یورپ و امریکہ میں بہت سی درسگاہیں موجود ہیں۔ اور جب اسلامی دنیا اپنے تعلم کے دور سے گذر رہی ہے اس کو چاہیئے کہ زندگی کے دوسرے ضروری علوم و فنون کو مہذب دنیا کی درسگاہوں سے حاصل کرے۔ بہت ممکن ہے کہ خدائے تعالیٰ مسلمان طلبا اور طالبات کو ایسی توفیق بخشے کہ وہ دنیائے تمدن سے ہر علم و فن کے خزانے حاصل کر سکیں اور کچھ دنوں کے بعد نہ صرف یہ کہ علوم و فنون میں مغربی ممالک کے برابر آ جائیں بلکہ کچھ اور آگے بڑھ کر قدم رکھ سکیں۔ "وما ذلک علی اللہ بعزیز" عالم اسلام کا روشن مستقبل ہماری قریب ترین آرزو ہے۔

رہ علم است از سر کردہ پا باید دوید این جا
کہ پا از سر نداند ہر کہ از خود پا کشید این جا

"ولا تیأسوا من روح اللہ۔ انہ لا ییأس من روح اللہ الا القوم الکافرون" (۱۲: ۸۷) یہ چیز ہے جو ارباب علم اور صاحبان لبست و کشاد کی خدمت میں ایک مدت سے میں عرض کرنا چاہتا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ بیخبر نہیں ہیں۔ بلکہ ان چیزوں کو خوب جانتے ہیں۔

۲ ستمبر ۱۹۴۶ء
بیت الخلافت، بمبئی

(عربی سے ترجمہ: عبدالخالق نقوی)

اگر آپ اپنی قومی زندگی کی موجودہ پستی پر مطمئن ہیں تو میں آپ کو بشارت دیتا ہوں کہ آپ کے مدرسے ہی کیا، آپ کا سارا تعلیمی نظام بالکل ٹھیک ہے، اس میں ذرا تبدیلی نہ کیجئے؛ وہ معاشرت میں اندھی تقلید، مذہب میں کھوکھلی رسمیت، سیاست میں غلامانہ محکومیت پسندی کے پیدا کرنے، علم میں ذوقِ تحقیق اور فنون میں ذوقِ تخلیق سے نوجوانوں کو بے بہرہ رکھنے، اور کمزور جسم، بے نور دماغ اور بے سوز دل پیدا کرنے کے نہایت کامیاب کارخانے ہیں۔

مسلمان ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ایک خاص جماعت سے تعلق رکھتا ہے اور اسی کے دنیاوی اور سیاسی مفاد کی ادھیڑبن میں لگا رہتا ہے۔
مسلمان پر ساری دنیا کی ذمہ داریاں بھی ہیں، اپنے ملک کی ذمہ داریاں بھی ہیں، مسلمان ہونے کے معنی ہیں ذہنی زندگی کا ایک مطمح نظر رکھنا، اقدار کا کوئی نظام ماننا، اخلاق کے کچھ معیار تسلیم کرنا، پست و بلند، خوب و زشت کے کچھ پیمانے برتنا، صالح انفرادی اور صالح اجتماعی زندگی کا کوئی نقشہ، فرد اور جماعت کے ربط کا کچھ تصور ذہن میں رکھنا ....
ایک ایسی دنیا جو نسل و وطن اور دولت کی تفریقوں سے انسانیت کے لئے جہنم بن گئی ہے، پھر ہم سے اس حقیقی عدل و مساوات کی فرمانروائی کا پیام سننے، اور اس کا عملی تجربہ دیکھنے کے لیے بیتاب ہے جو ایک امی نبی نے دنیا کو سنایا اور دکھایا تھا، کیا ملتِ اسلامیہ اس تقدیر، اس موقع اور اس ذمہ داری کو دو روٹیوں کے بدلے بیچ دیگی؟

(ڈاکٹر ذاکر حسین)